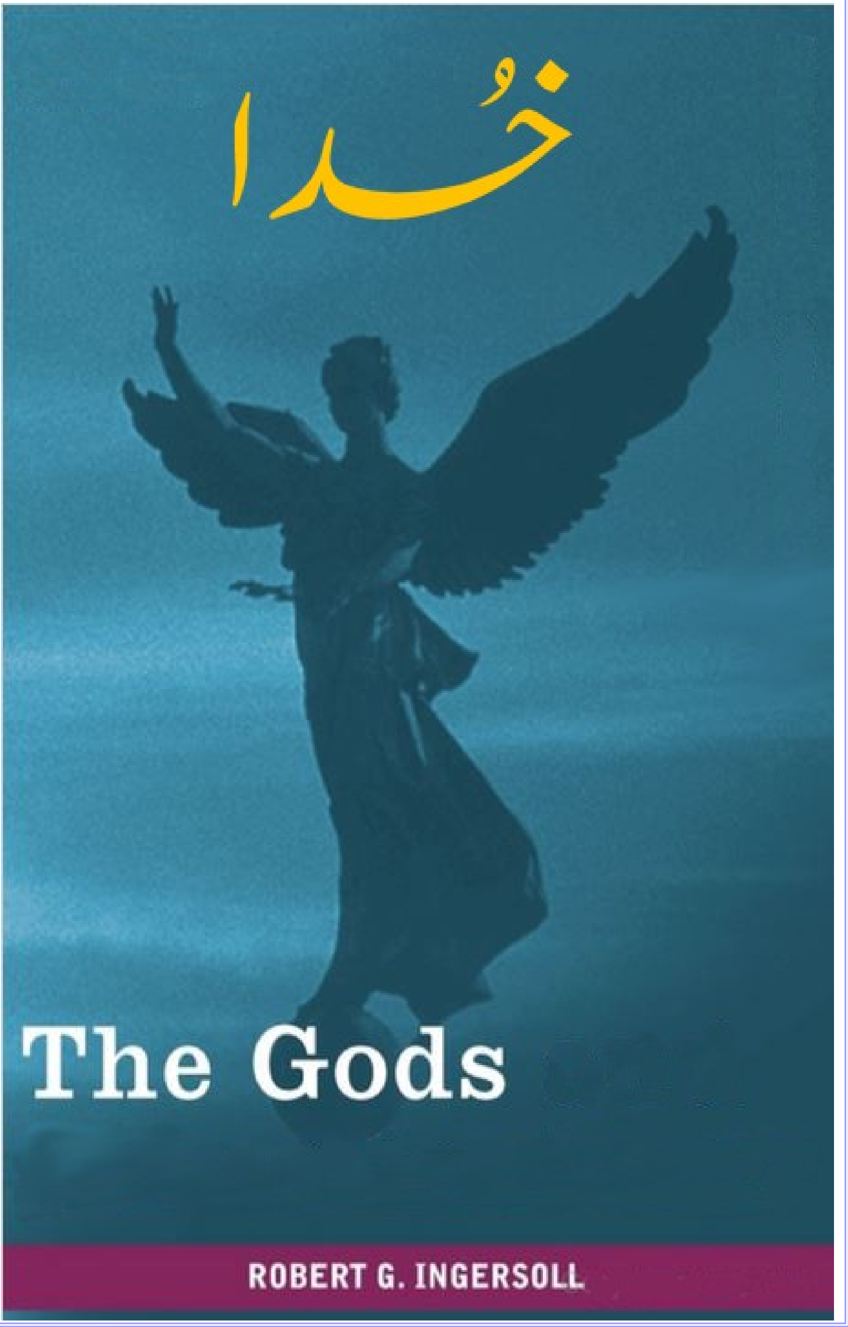


خُدا
The Gods
ROBERT G. INGERSOLL

Inspired by Robert Ingersoll's Lecture titled as

The Gods

خدا

رابرٹ انگرسول کی تقریر "خدا" سے ماخوذ

اردو تقلیب

از

رہبر رہبر

پیشکش

جراتِ تحقیق

www.RealisticApproach.org



رابرٹ انگرسول

پیش لفظ

رابرٹ انگر سول ۱۸۳۳ میں پیدا ہونے والا ایک امریکی وکیل، مذہب کا ناقد، سیاسی رہنما اور مقرر تھا. الحاد کے پر جوش دفاع کی وجہ سے اس کو عام طور پر "عظیم بابائے ملحدین" بھی کہا جاتا ہے. انگر سول نے انیسویں صدی کے اواخر میں اپنی شہرہ آفاق تقاریر سے مذاہب کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا سلسلہ شروع کیا تھا. اس کی ایک مشہور تقریر " دا گوڈز " سے ماخوذ یہ مضمون پیش کیا جا رہا ہے.

جب ترجمہ شروع کیا تو خیال تھا کہ لفظی ترجمہ کرنا ہی درست ہو گا. لیکن پہلی چند قسطوں میں ہی محسوس ہو گیا کہ ایک تو انگر سول نے انتہائی مشکل اور انیسویں صدی کے اواخر کی دقیق انگریزی زبان میں اس کو لکھا تھا. اور دوم یہ کہ انہوں نے یہ تقریر اپنے سامعین کو، جو کہ زیادہ تر امریکی مسیحی تھے، مد نظر رکھ کر لکھی تھی. میں نے سوچا کیوں نہ اس کو اردو پڑھنے والوں اور اس خطہ کے رہنے والے لوگوں کے مطابق ڈھال لیا جائے. تو مرکزی خیالات تو لازماً

انگرسول صاحب کے ہی لیے مگر زبان، اسلوب اور پس منظر کچھ ایسا استعمال کیا کہ اردو داں طبقے کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو. اب چونکہ یہ حرف بہ حرف ترجمہ نہیں رہا، اس لیے اس ترجمہ کو رابرٹ انگرسول کی اُس مشہور تقریر سے ماخوذ ہی کہا جاسکتا ہے.

بہرحال کوشش یہی رہی ہے کہ زبان اور خیالات کو کچھ ایسے انداز میں رقم کروں کہ مضمون عام فہم رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ حاصل کرسکیں.

ان خیالات کا سہرا صرف انگرسول کے سر ہی باندھا جائے. میں نے تو انگرسول کی سوچ کو آپ تک پہنچانے کیلئے واسطے کا کام انجام دیا ہے. میری کمزور تحریر اگر اس تقریر کی تاثیر حرف بہ حرف آپ تک نہ پہنچاسکے تو قصور صریحاً میرا ہی ہوگا. انگرسول صدا انگرسول ہی رہے گا.

رہبر رہبر

اگست / 2014ء / 10

خدا

ہر قوم نے اپنا خدا تخلیق کیا تھا اور یہ خدا ہمیشہ اپنے خالقوں سے بڑی مماثلت رکھتا تھا. یہ خدا انہی چیزوں سے محبت یا نفرت کرتا تھا جن سے اس کے خالق محبت یا نفرت کرتے تھے اور یہ ہمیشہ اپنی خالق قوم میں طاقتوروں کی طرف داری کرتا تھا. ہر ایسا خدا انتہائی محب الوطن ہوتا تھا اور اپنی قوم کے علاوہ باقی تمام اقوام سے شدید نفرت کرتا تھا. یہ تمام خدا اپنی تعریف،خوشامد اور پرستش کے انتہائی دلدادہ ہوتے تھے. یہ قربانیوں کے شیدائی ہوتے تھے اور معصوموں کے خون کی خوشبو کے رسیا. یہ تمام خدا پادریوں کی زیادہ سے زیادہ تر تعداد کا اصرار کرتے تھے اور ان کے پادری زیادہ سے زیادہ لوگوں کی حمایت کا. ان پادریوں کا اولین کاروبار اپنے خدا کی بڑائی کا اور اس بات کا اصرار ہوتا تھا کہ ان کا خدا تمام دوسرے خداؤں کو پچھاڑ سکتا ہے۔

ان خداؤں کو عجیب و غریب نمونوں میں تشکیل دیا گیا تھا. کسی کے ہزاروں بازو ہوتے تھے تو کسی کے سینکڑوں سر. کسی کے گلے میں سانپوں کے ہار ہوتے تھے تو کسی کے ہاتھوں میں ہتھیار اور جسم پر پَر ہوتے تھے. کوئی نظروں سے پوشیدہ ہوتا تھا تو کوئی اپنے بدن کے بس ایک آدھ حصے کی جھلک ہی دکھاتا تھا. کچھ ان میں حسد کی آگ میں جلتے رہتے تھے اور کچھ ان میں بیوقوف بھی ہوتے تھے. کچھ ان میں اپنے آپ کو انسانوں کی شبیہوں میں تبدیل کرنے پر قادر تھے تو کچھ راج ہنسوں کی اشکال میں. کچھ بیلوں کی شکلیں اختیار کر سکتے تھے تو کچھ فاختاؤں کی. اور کچھ تو ان میں اپنے آپ کو مقدس روحوں کی شکل میں لا کر خوبصورت دوشیزاؤں سے ہم بستری بھی کرتے تھے. ان میں سے کچھ شادی شدہ ہوتے تھے اور کچھ ازلی کنوارے. ان میں سے چند کی اولادیں ہوتی تھیں جو بعد میں خود خدا بن جاتی تھیں اور پھر ان کی پرستش شروع ہو جایا کرتی تھی. یہ خدا عمومی طور پر انتقام پسند، مستی پسند، وحشی اور جاہل ہوتے تھے. جاہل اس لیے کیونکہ ان کی معلومات بس اتنی ہی ہوتی تھیں جتنی ان کے پادریوں کی۔

ان خداؤں کو انہی سیاروں کی اشکال کا جن کی تخلیق کا یہ دعوی کرتے تھے، ادراک تک نہیں ہوتا تھا. اس زمین کو سب کے سب چپٹا ہی بتاتے تھے. کچھ کا

خیال ہوتا تھا کہ وہ سورج کو روک کر دن کو لمبا کر سکتے تھے. یا پھر ایک صور پُھنکوا کر شہروں کی فصیلوں کو گرواسکتے تھے. اور تمام کے تمام اپنی ہی تخلیق کردہ مخلوق کی اصل فطرت سے اس حد تک ناواقف ہوتے تھے کہ انہیں اپنے آپ سے محبت کرنے کا حکم دیتے تھے. اور کچھ خدا تو اتنے نادان ہوتے تھے کہ سمجھتے تھے کہ بس ایک حکم سے ہی اپنے بندوں کو مشاہدے، تجربے اور دلیل سے دور کر کے اپنی خواہشوں کے مطابق ڈھال لیں گے. ان میں سے کسی بھی خدا کو اس چھوٹی سی زمین کی شروعات کا کوئی اندازہ نہیں تھا. یہ سب کے سب خدا ارضیات اور فلکیات کے علوم سے مکمل طور پر ناآشنا تھے. قانون سازی سے تو ان کا دور دور تک کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا اور بطور سربراہ تو اکثر ناکام ہی رہتے تھے.

یہ تمام خدا توہین آمیز فرمانبرداری مانگتے تھے اور توقع رکھتے تھے کہ ان کو خوش رکھنے کیلئے بندے خاک میں اپنا منہ رگڑتے رہیں گے. یہ اور بات ہے کہ جن لوگوں نے ان خداؤں کو تخلیق کیا ہوتا تھا ان کے ساتھ یہ انتہائی طور پر جانبدارانہ رویہ رکھتے تھے. یہاں تک کہ ایسے لوگوں کو یہ خدا لوٹ مار، قتل و غارت گری اور اور مخالفین کی بیٹیوں اور بیویوں تک کو بھی پامال کر دینے کی کھلی چھٹی دے دیا کرتے تھے.

کچھ ہی اقوام اتنی غریب گزری ہوں گی کہ اپنا خدا نہ بنا سکی ہوں. ان کا بنانا اتنا آسان ہوتا تھا، اور خام مال اتنی وافر مقدار میں دستیاب، کہ نہایت ہی کم خرچے میں ایک اچھا خاصا خدا بن جایا کرتا تھا. اسی لیے خداؤں کا بازار خاصا گرم رہتا تھا اور آسمان ان تخیلاتی ہستیوں سے بھرے پڑے تھے. یہ خدا نہ صرف آسمانوں کی دیکھ بھال کرتے تھے بلکہ اپنے پجاریوں کے تمام زمینی معاملات میں بھی دخل اندوزی ان کے کاموں کا حصہ ہوتی تھی. ہر معاملے اور ہر کسی پر صدارت انکا حق ہوا کرتا تھا. ہر محکمہ ان کی زیر نگرانی ہوا کرتا تھا. ہر چیز پر یہ مکمل طور سے قابض ہوتے تھے. چھوٹے سے چھوٹے پرندے کی اڑان ہو یا بڑے سے بڑے سیاروں کی گردش، کوئی چیز نہ اتنی چھوٹی ہوتی تھی نہ اتنی بڑی کہ ان کے باریک بین مشاہدے اور دسترس سے باہر ہو. اکثر اوقات یہ خدا اپنے آسمانی تختوں سے زمین پر اتر کر انسانوں کو معلومات فراہم کیا کرتے تھے. مثلاً گرج چمک کے ساتھ زمین پر اتر کر انسانوں کو بتاتے تھے کہ بچوں کو ماؤں کے ہی دودھ میں نہ پکایا کریں. ان میں سے کچھ خدا صرف اس لیے بھی اپنے شاندار تختوں سے زمین پر اتر آیا کرتے تھے کہ چند عورتوں کو یہ بتا سکیں کہ ان کو بچے جننے چاہیئں یا نہیں یا پھر پادریوں کو ان کے کپڑوں کا صحیح ناپ بتا دیں یا پھر پرندوں کی انتڑیوں کے

پاک اور صاف کرنے کا صحیح طریقہ۔

جب لوگ ان میں سے کسی ایک خدا کی پرستش چھوڑ دیتے تھے، یا اس کے پادریوں کو کھانا اور کپڑے نہیں دے پاتے تھے (جو تقریباً ایک ہی بات سمجھی جاتی تھی) تو وہ خدا اس قوم پر وبا یا قحط بھیج دیا کرتا تھا۔ اگرچہ بسا اوقات اس قوم کو کسی اور قوم کا غلام بھی بنا دیتا تھا، جو ان کی بیویوں اور بچوں کو بیچ دیا کرتے تھے، مگر عمومی طور پر وہ اپنا انتقام ان کی پہلوٹھی کی اولادوں کے قتال کی قربانی سے لیتا تھا۔ اس دوران پادری اپنے مکمل فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ نہ صرف ان آفات کی پیشن گوئیاں کرتے تھے بلکہ اتفاقاً اگر یہ پیشین گوئیاں پوری ہو جاتی تھیں، تو اس قوم کو بتاتے بھی تھے کہ یہ سب ان کے بخل کا نتیجہ تھیں۔

یہ خدا ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف ہوتے تھے جتنی کہ ان کی خالق قومیں۔ عظیم اور طاقتور قوموں کے خدا بھی عظیم الشان ہوتے تھے جبکہ کمزور قوموں کو نحیف خداؤں پر ہی گذارا کرنا پڑتا تھا۔ یہ تمام خدا اپنی قوموں کو بعد از مرگ خوشحالی کی نذیر دیتے تھے۔ ازل سے لے کر آج تک ان خداؤں کو سب سے زیادہ غصہ اپنے وجود کے انکار پر آتا ہے۔ اسی لیے ان کا محبوب ترین مشغلہ لا

دینوں کی قتل و غارت کے احکام صادر کرنا ہوتا تھا۔ ایسے لوگوں کو ایک ابدی عذاب کی دھمکی دیتے تھے جو یا تو ان کے وجود پر یقین نہیں رکھتے تھے اور یا جو سمجھتے تھے کہ شاید ان خداؤں سے بھی برتر کوئی خدا ہو۔ بہر حال بدترین جرم، ان خداؤں کے وجود سے صریحاً انکار ہی ہوتا تھا۔ معصوموں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیں، مسکراتے بچوں کو ان کی ماؤں کی گودوں میں ہی گلا گھونٹ کر قتل کر دیں، دھوکہ دہی، چالاکی اور نوسربازی سے لوگوں کی زندگیاں اجاڑ دیں تو بھی آپ کے جرائم قابل معافی ہیں۔ شرط بس یہ ہے کہ آپ شرک یا الحاد جیسے گھناونے جرم کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ ان جرائم پر ان آسمانی بھوتوں، یعنی خداؤں، کا محبت بھرا چہرہ یکدم قہر سے سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ جنت کے دروازے آپ پر ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے جاتے تھے اور دوزخ کی اندوہناک اتاہ گہرائیاں ہمیشہ کے لیے آپ کا مقدر بنادی جاتی تھیں۔

ان ہی خداؤں میں سے ایک خدا، جس کی ہم حمد و ثناء گاتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں، نے اپنی قوم کو کچھ اس طرح کے قوانین حرب دیئے:

"جب تم کسی شہر پر جنگ کے مقصد سے آن پہنچو تو پہلے امن کا پیغام دو۔ اور

اگر وہ امن پر راضی ہوں تو ان کو عمر بھر کی غلامی میں لے لو تا کہ تمہاری تا حیات خدمت کر سکیں. اور اگر جنگ کرنا چاہیں تو ان کا محاصرہ کر لو. اور جب تمہارا خدا وہ شہر تمہارے ہاتھوں میں دے دے تو ان میں سے ہر مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر دو. صرف عورتوں کو اور بچوں کو اور مال مویشیوں کو زندہ رہنے دو تا کہ کہ تم خدا کے دیئے ہوے مال غنیمت کا لطف لے سکو. یہی حال ان تمام شہروں کا کرو جو اس قوم کے شہر نہ ہوں اور تم سے دور ہوں. مگر اسی قوم کے تمام شہر جو تمہارے خدا نے تمہیں تفویض کیے ہوئے ہیں، ان میں کسی بھی ذی روح کو زندہ مت رہنے دو."

کیا ان سے بھی زیادہ ظالمانہ احکامات کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ ایسی ہدایات ایک ظالم بدروح ہی دے سکتی ہے؟ یاد رکھئے کہ یہ احکامات حملہ آوروں کے لیے دیئے گئے تھے. محصور لوگوں کو تو امن کی خواہش کی صورت میں بس عمر بھر کی غلامی ہی قبول کرنا تھی. اور اگر ان مظلوموں میں سے کوئی اتنی ہمت کرتے کہ اپنے گھروں کی حفاظت کرتے یا اپنے بیویوں اور بچوں کی محبت میں لڑتے تو پھر ہر ذی روح کا قتل لازم تھا. اور ہمیں کہا جاتا ہے کہ ایسے خدا کی گھٹنوں کے کے بل جھک کر عبادت کریں اور اسے کہیں کہ تو رحیم ہے، تو

کریم ہے، تو ہی محبت کا پیکر ہے. ہمیں کہا جاتا ہے کہ اپنے اندر کی اچھائی کی ہر فطری سوچ کو روند اس کے سامنے ان مظالم کے باوجود گڑ گڑائیں. اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو نہ صرف اس دنیا میں ہی اس کے پجاری ہم سے نفرت کریں گے، ہمیں لعنت ملامت کریں گے بلکہ آخرت میں بھی ہمیں ایک لامتناہی اور درد ناک عذاب کی وعید سنائی جاتی ہے. اس کے پجاری جتنی چاہے ہم سے نفرت کرلیں، یہ خدا جتنی چاہے دھمکیاں دے لے ہم اپنے ذہنوں کو علم سے آراستہ کرینگے. ہم بھی ایسے خدا کی حکم عدولی کریں گے. ہم بھی اس سے نفرت کریں گے.

بعد کی کتابوں میں بائبل ہی کی مثال لے لیں. یہ بھی ایسے ہی بھیانک اور روح کو لرزا دینے والی داستانوں سے بھری پڑی ہے. اور یہ کتاب ہمارے سکولوں میں بچوں کو پڑھائی جاتی ہے تا کہ وہ رحم دل، مہربان اور محبت کرنے والے بن سکیں. یہی کتاب ہمارے آئین کے لئے انصاف اور حکومت کے قوانین کا منبع بھی ہے. اور ہمیں کہا جاتا ہے کہ اس کی خوفناک کہانیوں اور کرب ناک قوانینِ حرب پر ایمان لائیں کیونکہ یہ کلام الہی ہے. اور وہ بھی کسی ثبوت، کسی دلیل اور کسی مشاہدے کے بغیر. جس لمحے ہم اپنی آنکھوں پر تقدس کی پٹی باندھ کر، اور اپنی

سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بالائے طاق رکھ کر، ایک کتاب کو کلام الہی سمجھتے ہوئے اس پر ایمان لاتے ہیں اسی لمحے سے ہم ذہنی غلامی کی ایک نہ ختم ہونے والی زنجیر میں بندھتے چلے جاتے ہیں. اس سے زیادہ مزاحیہ بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ خدا اپنی ہی تخلیق کردہ ایک ذہین مخلوق سے اپنے کلام میں مخاطب ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کو سوچنے سمجھنے کی اپنی ہی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی صورت میں آگ کے شعلوں کا ہمیشہ کے لیے لقمہ بنا دینے کی دھمکیاں بھی دیتا چلا جاتا ہے. اگر ہمیں سوچ کی صلاحیت دی ہے تو پھر کسی خدا کو حق نہیں پہنچتا کہ ہمیں اس سوچ کے مطابق عمل سے روکے.

یہ کہنا کہ ہمارے مستقبل میں خوشیوں کا دار و مدار ہمارے عقیدوں پر ہے ایک دیو پیکر جھوٹ ہے. اور یہ کہنا کہ ایمان والے اور عقید تمندوں کو تو ابدی خوشیاں ملیں گی جب کہ دلیل، مشاہدے اور تجربے پر یقین رکھنے والوں کے لئے ایک لامتناہی اور دردناک عذاب ہی ہو گا ایک ایسا مذاق ہے کہ جس کا رد کرنا بھی تذلیل کے سوا کچھ نہیں. ایسے یقین کو صرف جہالت اور پاگل پن کا وہ اُداس مرکب ہی آرام دے سکتا ہے جس کو ایمان کہتے ہیں. اس حقیقت کے باوجود کہ کون سا ایسا خدا ہو گا جس کو خونریزی ہی خوش کر سکتی ہو، مذاہب کی بنیاد اسی بات

پر ہے۔ یہودیوں نے خدا کو جانوروں کے خون سے رام کیا جبکہ مسیحیوں کے مطابق خدا کا دل عیسیٰ کے خون کے نذرانے کے بعد ہی جا کر کہیں اتنا نرم ہوا کہ چند اور لوگوں کو بھی بخش دیا۔ یہ سوچنا ہی بڑا مشکل کام ہے کہ انسانی ذہن ایسے خوفناک خیالات کو آشیرباد دے سکتا ہے۔ یا پھر ایک باہوش و حواس انسان کسی آسمانی کتاب کو کسی خدا کا کلام سمجھ کر پڑھ سکتا ہے۔

ان کتابوں کے آسمانی ہونے یا نہ ہونے کا انسانوں کی ذہنی آزادی سے کوئی موازنہ نہیں۔ نجات غلامی کے ذریعے نہیں بلکہ غلامی سے نجات ہی اصل کاوش ہے۔ جب تک انسان ان کتابوں کو آسمانی کلام سمجھتا رہے گا تب تک یہ کتابیں اس کی آقا بنی رہیں گی۔ اس صدی کی تہذیب ایمان کی نہیں بلکہ آزاد شعور کا نتیجہ ہے۔

کسی بھی شخص کو باور کروانے کے لئے کہ یہ آسمانی کتابیں کسی آسمان سے نہیں اتریں بلکہ ایک انسانی ذہن کی ہی ایک وحشی اختراع ہیں، صرف ان کتابوں کا مطالعہ کروانا ہی کافی ہے۔ ان کتابوں کو ایسے پڑھئے جیسے آپ کسی بھی کتاب کو پڑھتے ہیں۔ آنکھوں سے تقدس کی پٹی اتار کر، اپنے دلوں سے خوف کا بھوت

نکال پھینک کر، اپنے اذہان کو توہمات سے آزاد کر کے ان کو بس ایک دفعہ پڑھیئے. آپ حیران رہ جائیں گے کہ آپ نے کبھی ایک لمحے بھی ان کتابوں میں دی ہوئی ظلم وجہالت کی داستانوں کو کسی عظیم خالق کا کلام سمجھا تھا.

ہمارے آباء و اجداد کے پاس صرف خدا سازی ہی کے کارخانے نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ وہ شیطان بھی اتنی ہی دل جمعی کے ساتھ بناتے رہتے تھے. یہ شیطان عمومی طور پر یا تو خداؤں کے ناپسندیدہ فرشتے ہوا کرتے تھے یا ماضی کے کوئی چھوٹے موٹے خدا. ان میں سے کچھ نے تو ناکام بغاوتوں کے مرتکب ہوا کرتے تھے تو کوئی کسی خدا کی بیوی کے ساتھ بوس و کنار کرنے کے مجرم. یہ شیطان عام طور پر انسانوں کے ہمدرد ہوتے تھے. ان کے بارے میں ایک حیران کن حقیقت یہ ہے کہ تقریباً تمام مذاہب میں شیطان ان مذاہب کے خداؤں سے زیادہ انسان دوست اور رحمدل ہوا کرتے تھے. کسی شیطان نے آج تک اپنے کسی جرنیل کو بچوں کے قتال کا یا حاملہ عورتوں کے پیٹ چیر دینے کا حکم جاری نہیں کیا. ایسے مظالم کے احکام صرف خدا ہی جاری کیا کرتے تھے. وبائیں خدا ہی بھیجتے تھے. اور ایسے قحط بھی جن میں معصوم بچے اپنی ماؤں کی سوکھی چھاتیوں سے کچھ نہ پا کر بھوک سے بلک بلک کر انہی کی گود میں دم توڑ دیا کرتے تھے. کسی شیطان

پر آج تک کبھی بھی ایسا ظالمانہ اور وحشیانہ الزام نہیں لگا.

انہی کتابوں کے مطابق انہی خداؤں میں سے ایک خدا نے ایک دفع سوائے آٹھ انسانوں کے تمام کی تمام مخلوق کو سیلاب میں غرق کر دیا تھا. بوڑھے، جوان، لاچار، غرض جو بھی زندہ تھا اس وقت ان سب کے سب کو ظالم سیلاب کی نذر کر دیا. اس سے زیادہ خوفناک واقعہ شاید ہی ان پادریوں نے کبھی گھڑا ہو. اور وہ بھی کسی شیطان کے نام پر نہیں بلکہ اسی خدا کے نام پر جس کی عبادت اور ستائش یہی جاہل پادری لازم گردانتے تھے. کیا کوئی نہیں سوچتا کہ شیطان کے نام سے کوئی ایسا بربریت کا واقعہ یہ پادری کبھی سامنے نہیں لائے؟ یہ تو ایک ایسا واقعہ ہے کہ اگر شیطان اس کا حکم دیتا تو اس کی ذات پر یہ ایک انمٹ دھبہ کہلایا جاتا.

انہی خداؤں میں سے ایک خدا نے انسانوں کی غلامی کے بارے میں یہ ہدایات جاری کی تھیں:

"اگر تم ایک عبرانی غلام خرید لاؤ تو چھ سال وہ تمہاری غلامی کرے گا اور ساتویں سال آزاد سمجھا جائے گا. اگر وہ خود ہی آیا تھا تو خود ہی چلا جائیگا. اگر وہ شادی شدہ تھا تو اس کی بیوی اس کے ساتھ جائے گی. اگر اس کو بیوی اس کے آقا

نے دی تھی اور اس بیوی سے اس غلام کے بیٹے اور بیٹیاں تھے تو وہ بیوی اور بچے پھر سب آقا کی ملکیت ہوں گے اور غلام اکیلا آزاد ہو گا. اگر وہ غلام اپنی مرضی سے کہہ دے کہ وہ اپنے آقا اور اپنے بیوی بچوں سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ ایسی آزادی ہی نہیں چاہتا تو اس کا آقا اس کو ایک دروازے کی چوکھٹ سے لگا کر کسی اوزار سے اس کے کان میں ایک چھید کرے گا اور اب یہ عبرانی تمام عمر اس آقا کی غلامی کرے گا."

یہ کیسا خدا ہے جو ایک غلام کو آزادی صرف اس صورت میں دے سکتا ہے کہ وہ غلام ہمیشہ کیلیئے اپنے معصوم بچوں اور ان بچوں کی ماں سے جدا کر دیا جائے؟ کیا کسی شیطان نے کبھی کسی شوہر یا باپ کو اتنا ظالمانہ انتخاب دیا ہے؟ کون عبادت کرے ایسے خدا کی؟ کون ایسے ظالم رب کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی حمد و ثناء کرے؟

شیطان کا اولین ذکر آسمانی کتاب جینسس (Genesis) میں آتا ہے. اور وہ کچھ اس طرح سے ہے:

تو پھر ناگ عورت کے قریب آیا اور کہا "کیا خدا نے تمہیں باغ کے درختوں

کا میوہ کھانے سے منع کیا ہے"؟ عورت نے جواب دیا "ہمیں خدا نے کسی اور درخت کا میوہ کھانے سے منع نہیں کیا ماسوائے باغ کی بیچ میں جو درخت ہے جس کا نہ ہمیں میوہ کھانے کی اجازت ہے اور نہ ہی چھونے کی مبادا ہماری موت ہی واقعہ ہو جائے" اس پر ناگ عورت سے بولا "تم اس درخت کا پھل کھانے سے یقیناً کبھی نہیں مرو گی. بلکہ خدا کو خوب پتہ ہے کہ جس دن یہ کھاؤ گی تو تمہاری بھی آنکھیں کھل جائیں گی اور تم بھی خدا جیسی ہو جاؤ گی. اور اسی کی طرح برائی اور بھلائی کی تمیز کر سکو گی" تو عورت نے درخت کی طرف اور اس کے پھلوں کی طرف دیکھا اور مرغوب لگا. اس نے خود بھی کھایا اور اپنے شوہر کو بھی کھلایا. جب خدا نے یہ دیکھا تو کہا دیکھو بھلا بنی آدم اب ہمارے جیسے بننے چلا ہے اور برے اور بھلے کی تمیز کرنا چاہتا ہے. تو پیشتر اس کے کہ یہ اب عمر دوام کے درخت کا پھل کھائے اور لازوال ہو جائے کیوں نہ اس کو جنت سے ہی نکال باہر کیا جائے. پس اسنے بنی آدم کو جنت سے نکال پھینکا اور زمین پر بھیج دیا. اور جنت کے دروازوں پر ایک ننھے فرشتے کو ایک شعلہ رخ تلوار کے ساتھ دربان بنا دیا تا کہ عمر دوام کے درخت تک کبھی کوئی نہ پہنچ سکے"

اس ذکر کے مطابق تو شیطان کا وعدہ حرف بہ حرف پورا ہوا. حضرت آدم اور

بی بی حوا مرے بھی نہیں اور برے اور بھلے کی تمیز بھی سیکھ گئے.

مگر اس ذکر سے یہ ضرور پتہ چلا کہ خدا اب بھی تعلیم اور علم سے اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا آج کل ڈرتے ہیں. آج کل کے مذہبی ادارے علم کے درخت کی اتنی ہی سختی سے حفاظت کرتے ہیں اور بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ اس درخت کا پھل کہیں عام آدمی چکھ نہ لے. آج بھی وہ عام انسانوں کو اس درخت کے پھل سے یہ کہہ کر منع کرتے ہیں کہ یہ ان کے لیے انتہائی مضر ہے. اس وجہ سے مذہب سائنس کا، منطق کا، فلسفے کا اور دلیل کا بطور خاص دشمن ہے. لوگوں کو دوزخ کی آگ میں ہمیشہ جلائے جانے کی دھمکی پر ہی یہ آج بھی کروڑوں لوگوں کو علم کے درخت کے پھل سے دور رکھے ہوئے ہیں.

اگر اس آسمانی کتاب جینسس میں ناگ والا اور بی بی حوا والا واقعہ سچ مان لیا جائے تو کیا ہمیں اس سانپ کا شکر گزار نہیں ہونا چاہیے؟ وہ بنی آدم کا پہلا استاد تھا، تعلیم کا پہلا وکیل اور جہالت کا پہلا دشمن. وہ پہلی ہستی تھا جس نے انسان کے کانوں میں ”آزادی“ کا لفظ پھونکا جس نے اس کے دل میں شک، تفتیش، دریافت، ترقی اور تہذیب کی امنگ پیدا کی. میں تو کہتا ہوں کہ مجھے سوچ کی

طغیانیوں اور عمل کے طوفانوں میں پھینک دو مگر جہالت اور عقیدے کے مردہ سکون سے دور رکھو. نکال باہر کرو مجھے جنت سے مگر پہلے مجھے علم کے درخت کا پھل کھالینے دو.

کچھ قوموں نے اپنے خدا مستعار بھی لئے. یہودی توکب کے بحثیت قوم ختم ہو چکے تھے اور ان کا خدا بیکار ہی بیٹھا ہوا تھا. بھلا ہو ہمارے آباواجداد کا جنہوں نے ان کا خدا اور شیطان دونوں ہی اپنا لئے. یہ مستعار لیا ہوا خدا اب بھی چند لوگوں کی پوجا کا مرکز ہے اور اس شیطان سے اب بھی چند لوگ گھبراتے ہیں. ابھی بھی کچھ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ شیطان کا توبس یہی کام ہے کہ بے خبر لوگوں کو اپنے جال میں پھنسائے اور اس اچھے خدا کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھے.

میرے لئے، ذاتی طور پر، خدا اور شیطان کے تصور کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے. مجھے تو یہ ایک فطری عمل لگتا ہے. انسان ہی ان کا خالق تھا اور ویسے ہی حالات میں دوبارہ ان کو تخلیق کرے گا. نہ صرف انسان نے ان کو تخلیق کیا ہے بلکہ اجزائے ترکیبی بھی وہی رکھے تھے جو اس وقت اس کے ارد گرد تھے. عمومی طور پر انسان نے انہیں اپنے ہی نمونے پر تشکیل دیا تھا. اور ان کو ہاتھ، پاؤں،

سر، آنکھیں، ناک، کان اور اعضاءِ کلام سے بخشا تھا۔ پھر ہر قوم نے اپنے خداؤں اور شیطانوں کو نہ صرف اپنی ہی زبانوں میں بولنا سکھایا بلکہ ان کے اذہان میں تاریخ، جغرافیہ، فلکیات، غرضیکہ تمام علوم میں وہی غلطیاں ڈال دیں جو اس وقت اس قوم کی اپنی سمجھ میں تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی خدا اپنی خالق قوم سے نہ تو زیادہ آگے کی سوچ رکھ سکتا ہوتا تھا اور نہ ہی ترقی کر پاتا تھا۔ حبشیوں نے اپنے خدا کو گھنگریالے بال اور سیاہ رنگت دی۔ منگولوں نے ان کو زرد رنگت اور ترچھی آنکھیں دیں۔ یہودیوں کو شبیہیں بنانے کی اجازت نہیں تھی ورنہ تو ان کے خدا کی ضرور ستواں ناک، بیضوی چہرہ اور ٹھوڑی پر داڑھی ہوتی۔ یونانیوں کا زیوس ہو بہو یونانی ہی لگتا تھا۔ اور رومیوں کا مشتری تو ان کے ایوان بالا کا رکن لگتا تھا۔ مصریوں کا خدا ایک پر سکون چہرے والی ہستی تھی جو اس کے بنانے والوں کی محبت بھری فطرت کی عکاس تھی۔ شمالی علاقوں کے رہنے والوں کے خدا گرم پوستینوں میں دکھائی دیتے تھے جبکہ گرم علاقوں کے خدا تقریباً یباً ننگ دھڑنگ ہی ہوتے تھے۔ ہندوستانیوں کے خدا ہاتھیوں پر سوار نظر آیا کرتے تھے۔ قطب شمال کی قوموں کے خدا وہیل مچھلی کی چربی شوق سے کھاتے تھے جبکہ جزیروں پر رہنے والی قوموں کے خدا بہترین تیراک ہوتے تھے۔ چاہے یہ خدا بتوں کی

صورت میں ہوتے تھے، نقش کئے گئے جاتے تھے یا تراشے جاتے تھے، انہی کو اصلی خدا سمجھ کر پوجا بھی جاتا تھا اور نذر نیاز بھی دی جاتی تھیں.

آج کل بھی چند قومیں اپنے خداؤں کی بری طرح کھنچائی کرتی ہیں جب وہ ان کی دعائیں قبول نہیں کرتے. لوگ ان کو مارتے پیٹتے ہیں، کوسنے دیتے ہیں، لعنت ملامت کرتے ہیں. ان کو کہتے ہیں، "کمینی روح ہم نے تجھے شاندار مندروں میں بٹھایا، سونے کے زیورات سے آراستہ کیا، بہترین کھانے دیئے، اچھی اچھی خوشبوؤں سے معطر کیا اور تیری یہ مجال کہ تو ہماری دعائیں قبول نہ کرے." اس کے ساتھ ہی یہ لوگ ان کو ان عالیشان مندروں سے نکال باہر لاتے ہیں اور گلیوں کی غلاظت میں گھسیٹتے ہیں. اور اگر اتفاق سے اسی دوران ان کی دعائیں قبول ہو جائیں تو پھر سے اس خدا کو دھو دھلا کر، پاک صاف کر کے دوبارہ اسی مندر میں بٹھا دیتے ہیں اور اس کے سامنے سر بسجود ہو کر کہتے ہیں،" ہم نے بھی کچھ جلد بازی کی اور تو نے بھی ہماری دعائیں قبول کرنے میں کچھ دیر لگا دی. کیوں تو اپنے اوپر یہ تذلیل لاتا ہے؟ اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا. اس کو بھول جا. اب ہم تجھے پہلے سے بھی زیادہ آراستہ و پیراستہ رکھیں گے. بس آئندہ ذرا ہماری دعائیں قبول کرنے میں اتنی دیر نہ لگانا".

انسان کو کبھی بھی خداؤں کی کمی نہیں ہوئی. اس نے تقریباً ہر چیز کی ہی پوجا کی ہے. اس نے زمین، ہوا، چاند، تاروں، سورج، روشنی اور اندھیروں سے لے کر سانپوں اور غلیظ جانوروں تک کو خدا مانا ہے. کچھ وحشی قبائل تو مہذب قوموں کی دی ہوئی چیزوں کو ہی خدا بنا ڈالتے ہیں. ٹوڈا قبیلے کے لوگ گائے کے گلے میں باندھی جانی والی گھنٹی کی پوجا کرتے ہیں. کوٹا قبیلے کے لوگ دو چاندی کی رکابیوں کی پرستش کرتے ہیں جنکو یہ میاں بیوی سمجھتے ہیں. جب کہ ایک قبیلے نے تو تاش کے پتوں میں پان کے بادشاہ کو ہی خدا بنا ڈالا.

مرد چونکہ عورت سے جسمانی طور پر طاقتور ہے اس لیے زیادہ تر خدا بھی اسی جنس کے رہے ہیں. اگر عورتیں زیادہ طاقتور ہوتیں تو فطری بات تھی کہ یہ خدا بھی پھر زیادہ تر عورتیں ہی ہوتے. پھر ان کے جلوے بھی زنانہ ہوتے اور یہ مردوں کے لباسوں کی بجائے جھالروں، نیچے گلوں والے رنگین لباسوں، لمبے خوبصورت بالوں اور زنانہ تزیئن و آرائش کے ساتھ نظر آتے. یہ بات اب ان سے زیادہ آسان الفاظ میں نہیں بیان کی جاسکتی کہ ان خداؤں کے بنانے والے ان کو اپنی ذاتی خصوصیات کی آمیزش سے ہی بناتے تھے.

انسان کے لیے اپنے ارد گرد کے ماحول سے باہر سوچنا انتہائی محال ہے. اس کے لیے کسی ایسی چیز کا ادراک رکھنا جو نہ اسنے دیکھی ہو، نہ سنی ہو اور نہ ہی محسوس کی ہو تقریباًنا ممکن ہے. اس نے جو کچھ سنا، دیکھا اور محسوس کیا ہوتا ہے وہ بس انہی کو بڑھا چڑھا کر، توڑ موڑ کر، ملا جلا کر، علیحدہ علیحدہ کر کے، گھلا ملا کر، بگاڑ کر، بہتری لا کر یا ان کا آپس میں موازنہ کر کے ہی کوئی چیز سوچ سکتا ہے. مگر یکسر نئ تخلیق نہیں کر سکتا. طاقت کا استعمال دیکھا تو قادر مطلق کا خیال آیا. موت دیکھی تو حیات لا فانی کا سوچا. وقت کا گزرنا دیکھا تو ہمیشگی کا خیال آیا. اچھائی دیکھی تو خدا کا خیال آیا. بدی دیکھی تو شیطان ذہن میں آیا. خوشی اور سکون کے چند لمحے میسر ہوئے تو جنت کا سوچا. درد اور تکلیف دیکھی تو دوزخ کا تصور کیا. مگر یہ سب ان تمام خیالات کی صرف بنیاد ہی ہیں. عمارت تو انہی چیزوں کی آمیزش سے بنی ہوئی ہے جو اس نے دیکھیں، سنی اور محسوس کی ہوئی ہوتی ہیں. کسی شیر کو عقاب کے پر، بھینسے کے کُھر، گھوڑے کی دم، کنگرو کی پیٹ کی تھیلی اور ہاتھی کی سونڈ دے دیں اور پھر دیکھیں کہ کیا بلا تیار کر دی ہے آپ نے. سب اعضا حقیقی ہیں مگر بلا پھر بھی تصوراتی. بس کچھ ایسا ہی ان خداؤں کی تخلیق کا قصہ ہے. حرف آخر یہ ہے کہ انسان فطرت سے آگے کی سوچ نہیں رکھ سکتا. اور نہ ہی

فطرت سے اوپر یا نیچے جا سکتا ہے.

انسان اپنی جاہلیت میں یہ سمجھتا رہا ہے کہ اسکے ارد گرد کی ہر شے کسی ذہین اوپری طاقت کا مظہر ہے. آج تک مذاہب کا نصب العین ان فرضی طاقتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا رہا ہے. انسان یا تو خوف سے ان طاقتوں کے سامنے سر بسجود ہوتا تھا یا پھر کسی کام کے ہو جانے پر جذبہ تشکر سے. انسان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان طاقتوں کی خوشامد کرکے ان کو خوش رکھا جائے. گرج چمک سے یہ ڈرتا تھا. جب آتش فشاں پھٹتے تھے تو یہ گھٹنوں کے بل جھک جاتا تھا. گھنے جنگل جو خونخوار و عجیب جانوروں اور بڑے بڑے ناگوں سے اٹے پڑے تھے، گہرے سمندر، چاند اور سورج گرہن، ٹوٹتے ہوئے تارے، ستاروں کی ہیبت ناک خاموشی اور، سب سے بڑھ کر، موت کے اس کے ارد گرد ہمہ وقت منڈلانے سے اس کو یقین ہو چلا تھا کہ ان غیبی اور خطرناک قوتوں کا نشانہ یہ خود ہی ہے. عجیب و غریب بیماریاں جن میں یہ مبتلا رہتا تھا، بخار کی تپش، گھٹیا اور تشنج کے امراض کے جھٹکے، دماغ کی نفسیاتی بیماریاں اور ان کے نتیجے میں رات کے گھپ اندھیروں میں اس کے ڈراونے خوابوں نے مل کر اس کو یقین دلا دیا تھا کہ خوفناک آسیبوں کے جتھے ہر وقت اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں. اسلئے ان سے

چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے انسان نے خداؤں کا سہارا لیا. ان خداؤں کو یہ ہر وقت عبادت، پرستش، خوشامد اور چاپلوسی کر کے، ان کو نذر نیاز دے کر، راضی رکھنا چاہتا تھا. پرانے وقتوں کے تقریباً تمام وحشی انسان کچھ ایسی ہی بدگمانیوں کا شکار رہے تھے.

بڑے عرصے تک تمام قومیں یہی سمجھتی رہی تھیں کہ بیمار اور پاگل لوگوں میں بدروحیں حلول کر جایا کرتی ہیں. ہزاروں سال تک طب بس انہی بدروحوں کو نکال بھگانا سمجھا جاتا رہا ہے. پادری اور پروہت ایسے لوگوں کے آس پاس زوردار اور عجیب و غریب آوازوں میں منتر شنتر پڑھتے ہوتے تھے. یہ پیشوا ایسے مریضوں کے پاس صور پھونکتے تھے، ڈھول پیٹتے تھے اور کریہہ چیخیں نکالتے تھے. اور اگر یہ سب کچھ ناکام ہو جاتا تھا تو پھر کسی مزید طاقتور قوت کو بلانے کا بندوبست کیا جاتا تھا. ان قوتوں کو رام کرنا انتہائی اہم سمجھا جاتا تھا. اور بدنصیب مریض اس مقصد کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی چیز بھی ان پروہتوں کو دے دیا کرتا تھا. یہاں تک کہ اپنا عزیز ترین بچہ بھی قربان کرنے پر راضی ہو جاتا تھا. وہ سمجھتا تھا کہ ان قربانیوں سے وہ ایسی قوتوں کا دل موہ لے گا. آج بھی دنیا کے چند حصوں میں مذہب کے بیوپاری اپنا کاروبار بلکل ایسے ہی چمکائے بیٹھے ہیں. ان کا

طریقہ کار تب بھی ایسا تھا اور آج بھی یہی ہے کہ کبھی تو یہ خدا کے دربار میں انسان کے وکیل بن جاتے ہیں تو کبھی آسیبوں اور انسانوں کے درمیان حفاظتی دیوار۔ ایسے بد قسمت انسان ان مولویوں اور پیروں کے غلام بن جاتے تھے جو خدا سے ان کی سفارش کر سکتے تھے یا پھر بدروحوں اور جنات سے ان کی جان چھڑا سکتے تھے۔ یہاں تک کہ یسوع مسیح نے بھی ایسے لوگوں میں سے بدروحوں کے ریوڑ کے ریوڑ نکال بھگائے تھے۔ یہ یسوع مسیح کا تقریباً پیشہ ہی بن گیا تھا۔ یہی نکالی ہوئی بدروحیں بعد میں اس نبی پر ایمان بھی لے آیا کرتی تھیں۔ ایسی ہی نوسر بازی تقریباً تمام ہی انبیاء اور پیغمبر وقتاً فوقتاً دکھاتے رہے ہیں۔

حضرت عیسیٰ کا شیطان کی اشتعال انگیزیوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا اس بات کا ایک حتمی ثبوت سمجھا جاتا تھا کہ ان کی کوئی غیبی طاقت مدد کرتی تھی۔ ان کے ایک حواری حضرت عیسیٰ پر شیطان کی ایک ایسی ہی کوشش کا کچھ یوں ذکر کرتے ہیں پھر شیطان حضرت عیسیٰ کے پاس آیا اور ان سے کہا اگر تو خدا کی ہی بیٹا ہے تو ان پتھروں کو روٹیوں میں بدل دے۔' تو حضرت عیسیٰ نے جواب دیا یہ تو لکھا ہوا ہے کہ انسان کا گزارا صرف روٹی پر ہی نہیں ہو گا بلکہ خدا کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر ہو گا۔ پھر شیطان نے حضرت عیسیٰ کو ایک مندر کے اونچے مینار پر

لا بٹھایا اور ان کو کہا کہ تو اس مینار سے اپنے آپ کو گرا کر دکھا کیوں کہ لکھا گیا ہے کہ فرشتے تجھے زمین پر گرنے نہیں دیں گے۔ اس پر عیسیٰ نے جواب دیا یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ تو اپنے خدا کو اشتعال نہیں دلائے گا۔ پھر شیطان ان کو ایک بلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور وہاں سے تمام دنیا کی بادشاہتیں اور ان کی شان و شوکت دکھائی اور کہا اگر تو میرے سامنے جھک جائے اور میری پرستش کرے تو میں تجھے یہ سب کچھ عطا کر دوں گا۔

مسیحی اب یہ دعویٰ کرتے ہیں عیسیٰ ہی خدا تھا۔ اگر ایسا تھا تو یقیناً شیطان کو اس کا علم ہو گا۔ مگر پھر بھی شیطان نے اس قادر مطلق کو ایک مینار پر لا بٹھایا اور اس کو چھلانگ لگانے کی ترغیب دی۔ اور جب خدا اس کی باتوں میں نہ آیا تو پھر شیطان اس رب ذوالجلال کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور اس رب کائنات کو ایک ریت کے ذرے سے بھی چھوٹی زمین کی بادشاہت کی پیشکش کر دی۔ شرط صرف یہ رکھی کہ تمام کہکشاؤں کا یہ مالک اس شیطان کو بس ایک سجدہ کر دے جس کے اپنے نام زمین کے ایک گز کا ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ اب ذرا سوچیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ شیطان اتنا بڑا احمق تھا؟ ذرا سوچیے تو سہی کہ شیطان، یہ ماہر نوسرباز، چالاک ترین، عیار ترین، مکار ترین ہستی خدا کو ریت کے ایک ایسے ذرے کی

رشوت دینے چلا تھا جس کا مالک ویسے بھی خدا ہی تھا؟ کیا دنیا کی تمام مذہبی کتابوں میں اس سے بھی زیادہ کوئی مضحکہ خیز واقعہ بیان کیا گیا ہے؟

چند آسمانی کتابوں کے مطابق یہ شیطانی ارواح مختلف اقسام کی ہوتی تھیں. ان میں سے کچھ بول اور سن سکتی تھیں جبکہ کچھ گونگی اور بہری ہوتی تھیں. ان پر ایک ہی طریقے سے قابو نہیں پایا جا سکتا تھا. حضرت عیسیٰ کے ایک حواری ایک قصہ بتاتے ہیں کہ ایک دفع ایک شخص اپنے بیٹے کو حضرت عیسیٰ کے پاس لایا. لگتا کچھ یوں تھا کہ بچے پر ایک گونگی اور بہری روح قابض تھی جو نہ ان حواریوں کو سن سکتی تھی اور نہ ہی ان کے قابو آتی تھی. عیسیٰ نے اس بد روح سے کہا، " اے گونگی اور بہری روح، چل نکل بھاگ اس بچے کے جسم سے اور دوبارہ اس کے اندر حلول ہونے کی کوشش نہ کرنا." یہ بات 'سن' کر وہ 'بہری' روح، جو 'گونگی' بھی تھی، 'چیختی' ہوئی نکل بھاگی وہاں سے. یہ واقعہ دیکھ کر حضرت عیسیٰ کے حواری بہت متاثر ہوئے اور ان سے پوچھا کہ وہ کیوں اس بد روح کو نہیں بھگا سکے. عیسیٰ نے کہا، " وہ اس لیے کی اس طرح کی بد روحیں ایسا صرف بڑی عبادت اور روزوں کے بعد ہی کر سکتی ہیں." کیا اس بھری دنیا میں کوئی شخص ایسا ہو گا جو اس طوطا مینا کی کہانی پر یقین کر سکے؟ مصیبت یہ ہے کہ مذہبی لوگ دلیل کی صلاحیت

کو بند کر کے ہی اپنی کتابیں کھولتے ہیں.

پرانے وقتوں میں دنیا بھر کی اقوام شیطان کا وجود مانتی تھیں. اور اس بات میں اس وقت کے لوگوں کو کوئی شک نہیں تھا کہ ان شیطان روحوں پر قابو پانے کے لیے یا تو خود ان لوگوں کا خدا ہونا ضروری تھا یا کسی خدا کی مدد کی ضرورت تھی. تمام مذاہب کے خالقوں نے شیطان پر قابو کر کے اور فطرت کے قوانین کو معطل کر کے ہی آسمانی نمائندے ہونے کا دعویٰ کیا تھا. لوگوں میں سے ان شیاطین کو نکال بھگانا ایک پکی سند سمجھی جاتی تھی. جو نبی ایسا نہیں کر پاتا تھا اس کو لوگ قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے. لاکھ اچھی باتیں اپنی قوموں کو بتاتے، خود ایک پاکیزہ زندگی کا نمونہ ہوتے مگر جب تک ان بد روحوں پر قابو نہ پاتے اور معجزے نہ دکھاتے تب تک ایسے نبیوں کی عزت نہیں کی جاتی تھی.

نیکی اور بدی میں انسان کا یہ ایمان اس کے ارد گرد کے برے اور بھلے حالات سے ہی پیدا ہوا تھا. اپنے پر لطف تجربوں کو یہ اچھی ارواح کے ساتھ تعبیر کرتا تھا جبکہ منفی تجربات کو شیطانی ارواح کے ساتھ. یقین تو یہ تھا ہی کہ سب کے سب واقعات کے ظہور کی موجد یہ روحیں ہی ہوتی ہیں. پس اچھے واقعات والی روحوں

کو اچھا اور منفی واقعات والی روحوں کو شیطانی سمجھا جانے کے وجہ سے ہی خدا اور شیطان کا ایک عالمی تصور ابھرا.

بہت سارے لکھنے والوں کا خیال ہے کہ کوئی بھی عالمی سوچ فطری ہی ہوتی ہے. اور فطری خیال کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتا. اگر کسی سوچ کا عالمی ہونا ثابت کرتا ہے کہ ایسی سوچ فطری ہے اور فطری سوچ سچ ہوتی ہے تو پھر ان فطری باتوں پر یقین رکھنے والوں کو مان لینا چاہیے کہ ایک ایسے خدا کا لازم الوجود ہونا جو فطرت سے بالاتر ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسا ایک ایسے ہی فطرت سے بالاتر شیطان کے وجود کا ہونا. پھر شیطان کا وجود بھی اتنا ہی سچ ہے جتنا خدا کا وجود. سچ تو یہ ہے کہ خدا کا تصور اچھائی سے ابھرا ہے اور شیطان کا برائی سے. اگر دونوں ہی فطرت ہیں تو یہ وقتاً فوقتاً ایک دوسرے کے فرائض بھی انجام دیتے ہوں گے. جیسے خدا کا آفات، وباؤں اور مصیبتوں وغیرہ کا بھیجنا جو بلا تفریق تباہی پھیلاتے ہیں اور شیطان کا کسی کو خوشیاں دلانا چاہے عارضی ہی کیوں نہ ہوں. نتیجتاً ایک ایسے قادر مطلق کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ انسانیت کا دوست ہے یا دشمن. اگر تمام کے تمام دنیاوی واقعات خوشگوار ہی ہوتے تو یہ مان لینا آسان ہو جاتا کہ ان کو مظہر کرنے والا ایک رحمدل دوست ہے. ایسے ہی اگر یہ

تمام واقعات برے ہوتے تو بھی یہ ماں لینا آسان ہو جاتا کہ ان کو وقوع کرنے والا ہمارا بد اندیش ہی ہو سکتا ہے. مگر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اچھائی والا برائی بھی لاتا ہے اور برائی والا اچھائی بھی. اسی لیے تو ان میں تمیز کرنا مشکل تر ہو تا چلا جاتا ہے.

اور یہ کہ تمام اچھے اور برے واقعات آسمانوں سے ہی تجویز اور وقوع کیے جاتے ہیں کل بھی اتنا ہی بیو قوفانہ نہ خیال تھا جتنا کہ آج کل. پھر بھی زیادہ تر لوگوں کا اس بات پر ایمان ہونا ان کی تابڑ توڑ نمازوں سے ثابت ہوتا ہے. اس وقت بھی لاکھوں لوگ کسی خدا کے حضور سر بسجود پڑے ہوئے دعائیں مانگ رہے ہوں گے. رورو کر اور پیشانیاں رگڑ رگڑ کر دعائیں کر رہے ہوں گے کہ ان کا خدا فطرت کے قوانین کو نظر انداز کر کے ان کے حق میں دخل انداز ہو. کسی کو صحت چاہیۓ، کسی کو دانائی تو کوئی کسی دور پار محبوب کی خیر چاہتا ہے. کسی علاقے کے لوگوں کو بارش کی ضرورت ہے، تو ان کے ساتھ والے علاقے کے لوگوں کو دھوپ کی. کسی کو دولت کی ضرورت ہے تو کسی کو خوراک کی. لاکھوں لوگ اس وقت شیطان سے پناہ کی دعائیں مانگ رہے ہیں. کوئی انتقام چاہتا ہے تو کوئی انصاف. اور چند تو کسی جوۓ میں لگائی ہوئی شرط کو جیتنے کی بھی اس وقت دعائیں

کررہے ہوں گے۔ سب دعاؤں کا انحصار اس ایمان پر ہے کوئی تو ایسی قوت ہے جو کائنات کے نظام کو عارضی یا مستقل طور پر درہم برہم کر کے دعا گو کی خواہش پوری کر سکتا ہے۔ یہی یقین اقوام عالم میں پنپتا رہا ہے۔ تمام مذہبی کتابیں ایسے ہی ناقابل یقین واقعات سے بھری پڑی ہیں۔

اگر ہم ایک بالائے فطرت قوت کا سوچ سکتے ہیں تو پھر یہ سوچنا بھی عین فطری ہے کہ ایسی قوت دنیاوی معاملات میں دخل اندازی کر سکتی ہے اور کرے گی۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو پھر ایسی قوت کا کوئی عملی فائدہ سمجھ میں نہیں آتا۔ آسمانی کتابیں ان قوتوں کے ایسے محیر العقول واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ جانور انسانوں سے باتیں کرتے ہیں۔ سوکھی ہڈیوں سے پانی پھوٹ پڑتا ہے۔ سورج اور چاند کو اپنے مداروں میں روک دیا جاتا ہے تاکہ ایک عقیدتمند جرنیل کو قتل و غارت کے لیے زیادہ وقت مل سکے۔ آگ جلانا چھوڑ دیتی ہے۔ پانی راستہ دے دیتا ہے۔ گندم کے دانے جوؤں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چھڑیاں ناگوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور باقی تمام سانپوں کو نگل لیتی ہیں۔ پانی چڑھائی پر دوڑتا پھرتا ہے۔ ایک خاص قسم کے پتھر کو جنت سے بھجوایا جاتا ہے۔ پرندے آسمانوں سے پکے پکائے اترتے ہیں۔ انسانوں کی طاقت کا راز بالوں کی لمبائی میں ڈال دیا جاتا

ہے. مرے ہوئے لوگ پھر سے زندہ ہو جاتے ہیں. کٹنیاں اور جادوگر مرے ہوئے لوگوں کی ارواح سے کھلا کلام کرتے ہیں. اور خدا ایک انسان کی شکل میں آکر پہلے ایک درزی بن جاتا ہے اور پھر ایک سنگ تراش.

اس اچھائی اور برائی کے تصور نے، اور اس تصور کے ساتھ منسوب ایسے خداؤں اور شیطانوں نے اور دوزخ اور جنت نے، تو انسان کو چکرا کر رکھ دیا تھا. اس کا یہ ہمہ گیر خوف ہی اس کے لیے ایک عفریت کی شکل اختیار کر گیا. وہ تمام وقت بس پریوں اور جنوں میں، فرشتوں اور بھوتوں میں، جادوگروں اور کٹنیوں میں، خداؤں اور شیطانوں میں گھرا رہنے لگا. رات کے گھپ اندھیروں میں جنگلوں کے وسط میں سے دور کہیں سے آتی ہوئی خوفناک آوازیں غار میں لیٹے ہوئے اس انسان کے اعصاب کو تقریباً شل ہی کر ڈالتی تھیں.

یہ سوچ ہی آج ہمیں پاگل کر دیتی ہے کہ اس وقت کا انسان بے چارہ کن کن جسمانی اور ذہنی اذیتوں کا شکار تھا. کوئی تعجب نہیں کہ اسنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان خداؤں کے لیے مندر بنائے، پھر ان کے حضور اشک بار آنکھوں کے ساتھ سجدہ ریز ہوا اور قربان گاہ کو اپنے خون تک سے رنگین کر دیا. کوئی حیرت

نہیں کہ اس نے اپنے ہی جیسے انسانوں کو ان خداؤں تک پہنچنے کا وسیلہ بنا دیا. اور خود خاک میں رینگتا، لوٹتا پوٹتا ان مندروں تک جاتا اور گڑ گڑا گڑ گڑا کر ان خداؤں سے پناہ مانگتا تھا.

مگر وقت کے ساتھ ساتھ جوں جوں یہ وحشی انسان ترقی کرتا گیا توں توں اس کا ایمان ان پتھر اور لکڑی کے بنائے ہوے خداؤں سے اٹھتا گیا. مگر ساتھ ساتھ ہی حضرت انسان نے ان کی جگہ روحوں اور بد روحوں کو لا کھڑا کیا. جیسے جیسے یہ انسان مزید علم حاصل کرتا گیا ویسے ویسے اس نے ان روحوں کے جتھے سے بھی جان چھڑالی اور ان کی جگہ بس ایک قادر مطلق پر تکیہ کر بیٹھا. اور اب اس ہستی سے بھی، باوجود مسلسل خوشامد اور چاپلوسی کے، کچھ حاصل نہ کر پانے کے بعد یہی انسان آج اپنی سوچ، اپنے عمل اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے پر مجبور نظر آتا ہے.

آہستہ آہستہ لوگ سوچنا، سوال کرنا اور خود اپنے طور پر تفتیش کرنا شروع ہو گئے ہیں. اگرچہ یہ عمل تکلیف دہ حد تک سست رفتار ہے مگر یقیناً ان خداؤں کو انسان اب اپنی دنیا سے نکال باہر پھینکنا شروع ہو گیا ہے. اب تو انتہائی مذہبی لوگ

بھی یہ مان گئے ہیں کہ ان خداؤں کی دنیاوی معاملات میں دخل اندازی کچھ کم ہی ہوتی جارہی ہے. جب سے سمندری جہازوں اور ریل کے ذریعے اشیاء خورد و نوش کی ترسیل بڑے پیمانے پر ممکن ہو گئی ہے تب سے ان خداؤں نے بھی قحط جیسی آسمانی آفتیں بھیجنا کچھ کم ہی کر دی ہیں. اب کبھی کبھار ایک چھوٹے سے خاندان کو سبق سکھانے کے لیے ان کا بس ایک آدھ عزیز ترین بچہ اٹھا لیتے ہیں. طب اور ادویاء میں انسانی ترقی کے بعد انہوں نے مہلک وبائیں بھی بھیجنا کم کر دی ہیں. بڑی بڑی جنگوں میں تو کبھی کبھار یہ شاید دلچسپی لے لیتے ہیں مگر پہلوانوں کے مقابلے میں عمومی طور پر اب بہتر پہلوان ہی جیتتا ہے.

خداؤں کی یہ بے بسی مذہبی اداروں کے لیے البتہ ایک کڑوا گھونٹ ثابت ہو رہی ہے. ان کی مکمل بے بسی ثابت ہونا ان سفید ہاتھیوں کے لیے ایک ابدی موت کے برابر ہے. اسی لیے مذہب کے یہ بیوپاری گلے پھاڑ پھاڑ کر اپنے معتقد گاہکوں کو یقین دلاتے رہتے ہیں کہ یہ خدا اب بھی اپنا دعاؤں کے سننے اور لوگوں کی خواہشات عطا کرنے کے پرانے کاروبار کو اسی پہلی جیسی تندہی سے چلا رہے ہیں.

ایک مولوی اپنے بیٹے کے ذہن پر یہ بات نقش کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا کہ خدا بڑی سے بڑی مخلوق سے لے کر ایک چھوٹی سی چڑیا تک اپنی تمام خلقت کی دیکھ بھال کرتا ہے. اور ہر چیز پر اس کی اس محبت بھری توجہ کی چھاپ ہے. ایک دن ایک جھیل کے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کی توجہ جھیل کے کنارے خوراک کی تلاش میں پھرتے ہوے ایک بگلے کی طرف دلوائی اور کہنے لگا، "ذرا دیکھنا تو سہی کہ خدا نے اس بگلے کی ٹانگیں کیسے ان پانیوں میں پھرنے کے لیے بنائی ہوئی ہیں. کتنی خوبصورتی سے یہ پانی میں ایک بھی بلبلہ بنائے بغیر قدم رکھتا چلا جاتا ہے. اور یہ کیسی لمبی چونچ اس کو اللہ نے عطا کی ہے. اتنی خاموشی سے یہ مچھلی پر آن پہنچتا ہے کہ مچھلی کو خبر تک نہیں ہوتی اور بگلا اس کو ہڑپ کر جاتا ہے. کیا اب بھی یہ ممکن ہے کہ کوئی یہ سب کچھ دیکھے اور خدا کی اپنی مخلوق کے لیے اس مہربان اور ذہین توجہ کو نظر انداز کر دے؟" بچہ جواب میں بولا، " جی ابا جان. مجھے خدا کی اپنی مخلوق کے لیے محبت بھری فکر اس بگلے میں تو صاف صاف نظر آرہی ہے. مگر ابا جان کیا بگلے کے لیے خدا کی یہ فکر مچھلی کے لیے جان لیوا نہیں ثابت ہو رہی؟"

چند ترقی پسند مذہبی جو یہ تو مان چکے ہیں کہ خدا دنیاوی معاملات میں اب زیادہ

دخل اندازی نہیں کرتے، اب بھی یہ یقین رکھتے ہیں کہ ابتدا میں کبھی خداؤں نے اس کائنات کے لیے قوانین ضرور تشکیل دیئے تھے. اور ان ہی قوانین کی وجہ سے انسان ایک لیور کی مدد سے اپنے سے زیادہ وزن اٹھا سکتا ہے. اور ان ہی قوانین کے نتیجے میں خلا میں دو اجسام ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر نہیں ہو سکتے. اور یہ کہ حرکت میں آیا ہوا جسم تب تک حرکت میں ہی رہے گا جب تک روکا نہ جائے. اور یہ بھی کہ ایک کامل مربع کے چار مساوی لمبائی کی اطراف ہونا ضروری ہیں نہ کہ پانچ یا سات. ایسے مذہبی اصرار کرتے ہیں کہ اگر خدا ایسا نہ کرتا تو جزء کل سے بڑا ہوتا، ایک جمع ایک کا جواب دو سے زیادہ ہوتا اور ڈنڈوں اور رسیوں کا دوسرا سرا ہی نہ ہوتا یہ کہنا تقریباً ایسا ہی ہے کہ شکر کیا جائے ئے کہ اتوار کا دن ہفتے کے آخر میں آتا ہے درمیان میں نہیں. یا پھر موت زندگی کے اختتام پر آتی ہے ابتدا میں نہیں ورنہ ہمیں کفن دفن کے بندوبست کرنے کا وقت ہی نہ ملتا.

یہ لوگ بس ہر چیز پر خدا کی تشکیل کی انمٹ چھاپ دیکھتے ہیں. یہ بضد ہوتے ہیں کہ یہ کائنات خدا کی ہی بنائی ہوئی ہے. اور ثبوت کے طور پر سورج کی روشنی، پھولوں، بہار کے رنگوں، غرضیکہ ہر خوبصورت چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں.

کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ سرطان کی ابتدا ابھی ایک گلاب کی طرح اپنی سرخ رعنائیوں میں اتنی ہی پر کشش ہوتی ہے؟ کیا ان کو نظر نہیں آتا کہ خدا نے اسی سرطان کی پروان کے لیے کتنا زبردست انتظام کیا ہوا ہے؟ کتنا خوبصورت ہے ہاضمے کا نظام. کتنے خوش سلیقہ طریقے سے خون زہریلا ہو جاتا ہے تا کہ سرطان کو اپنی خوراک مل سکے. کتنے حیران کن طریقے سے خدا کا ترتیب دیا ہوا یہ انسانی نظام اس سرطان کو جلا بخشتا رہتا ہے. دیکھیں کیسے یہی سرطان اسی انسان کا گوشت کھا کھا کر پھلتا پھولتا ہے. کبھی کسی سرطان زدہ حصے کو کسی مائیکروسکوپ کے نیچے رکھ کر دیکھیں. آپ دنگ رہ جائینگے اس کے عجیب و غریب اور پیچیدہ ترین نظام کو اور اس کے دلکش رنگوں کو دیکھ کر. اس کی بھی ترتیب و تشکیل کسی معجزے سے کم نہیں دکھائی دے گی. انسان کی تمام تر کوششیں بھی نہ اس کی پروان کو روک سکتی ہیں اور نہ ہی اس کے نتیجے میں اس کے مریض کی سسکتی ہوئی دردناک موت کو. کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ اس معجزے کا خالق بھی وہی رب کائنات ہے جس کا دل اپنی مخلوق کی محبت سے پھٹا پڑا جاتا ہے؟

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے اور یہ سمجھنا کہ مادہ ہمیشہ سے موجود تھا ایک بیوقوفانہ خیال ہے. اور وہ اس لیے کے یہ بات تو صرف

اپنے ارد گرد ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر ہی ثابت ہو جاتی ہے. اگر کسی خدا نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے تو ضرور کوئی ایسا لمحہ ہو گا جب اس نے اس تخلیق کی ابتدا کی تھی. تو پھر اس لمحے سے پہلے ایک لامتناہی ہیشگی پر محیط ایک جاوداں وقت ایسا ہو گا جب کچھ نہ تھا پر صرف خدا تھا. اور یہ خدا اس خلا میں، اس کے ابدی سکوت میں، بالکل تنہا، بغیر کسی کام کسی مصروفیت کے رہا ہو گا. اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ کائنات کسی خدا نے ہی بنائی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کس چیز سے بنائی ہے؟ سوائے خدا کے کچھ بھی تو نہیں تھا. اب یہ تو کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کسی چیز سے بھی نہیں بنائی پھر تو صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ خدا نے اس کو اپنے وجود سے ہی بنایا ہو گا کیوں کہ اس وقت صرف وہی تھا. تو کائنات تو مادے سے بنی ہوئی ہے. پھر خدا بھی مادے سے ہی بنا ہوا ہو گا. اسی لیے شاید کسی نے کہا تھا کہ تخلیق کا عمل ابد کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو کہتے ہیں. مزید براں، یہ تو ثابت ہو ہی چکا ہے کہ یہ مادی کائنات لامتناہی ہے. اگر ایک لامتناہی کائنات کو ایک لامتناہی خدا نے اپنے وجود سے ہی تخلیق کیا ہے تو پتہ نہیں اس میں خدا کے وجود کا کتنا حصہ لگ گیا ہو گا اور کتنا خدا رہ گیا ہو گا.

لوگ دھیرے دھیرے ایک تخلیقی خدا کے تصور کو ترک کر رہے ہیں. کیونکہ

تقریباً تمام سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ مادے کا وجود ہمیشہ سے ہی رہا ہے. مادے کو چونکہ تباہ نہیں کیا جا سکتا اسی لیے اس کو تخلیق بھی نہیں کیا جا سکتا. اس صدی کی شاندار ترین دریافت طاقت کا لازوال اور ہر جگہ ہر وقت موجود ہونا ہے. نہ طاقت کو نہ مادے کو گھٹایا یا بڑھایا جا سکتا ہے. اور نہ ہی طاقت مادے سے علیحدگی میں رہ سکتی ہے. مادہ صرف طاقت کے ساتھ تعلق میں وجود رکھ سکتا ہے. نیتجتاً ایک ایسی طاقت کا تصور ہی لا حاصل ہے جو مادے سے علیحدہ اور فطرت سے بالاتر ہو.

تب تو طاقت یا توانائی، جو ایک ہی چیز ہیں، چونکہ تخلیق نہیں کی جا سکتیں تو ہمیشہ سے ہی رہی ہونگی. پھر یہ بات سمجھنا انتہائی آسان ہو جاتا ہے کہ طاقت اور مادہ نہ تو تخلیق کی گئی ہیں نہ ہی کسی کے حکم کی پابند ہیں. انسانی سوچ بھی اسی طاقت کا ایک مظہر ہے. ہم اتنی ہی طاقت سے چل پاتے ہیں جتنی کہ کہ ہم سوچ رکھتے ہیں. انسان ایک ایسا نامیاتی جسم ہے جو توانائی کی مختلف اشکال کو سوچ کی قوت میں تبدیل کرتا ہے. تو گویا انسان ایک ایسی مشین ہے جس میں ہم بطور ایندھن خوراک ڈالتے ہیں اور جس کو یہ سوچ کی قوت میں تبدیل کر دیتا ہے.

اس بحث کا لازم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر خدا کو نہ صرف مادی ہونا چاہیئے بلکے اس مادی جسم میں بھی توانائی کی دوسری اشکال کو سوچ کی قوت میں تبدیل کر سکنے کی خاصیت ہونی چاہیے. اس کو سادہ الفاظ میں ہم کھانا کھانا کہتے ہیں. اس لیے اگر خدا سوچتا ہے تو پھر خوراک اس کے لیے لازم بن جاتی ہے. ایسی قوت ہو ہی نہیں سکتی کہ جو سوچتی بھی ہو، طاقت کا استعمال بھی کرتی ہو اور اس کے اندرونی ترتیب میں توانائی کو طاقت میں تبدیل کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو. یا توانائی کی ہی سرے سے ضرورت نہ ہو. اگر نہ مادہ اور نہ ہی طاقت تخلیق کی گئی ہے تو پھر ہمارے پاس ایک بالائے فطرت قوت کا کیا ثبوت ہے؟ ایک مذہبی اس کا جواب شاید کچھ یوں دے گا، "ہمارے پاس قانون اور نظام ہے، سبب اور اثر ہے اور اس کے علاوہ، مادہ اپنے آپ کو خود حرکت میں ڈال ہی نہیں سکتا. "

چلیں، ازراہ بحث ہی سہی، یہ فرض کر لیتے ہیں کہ فطرت سے بالاتر کوئی ہستی نہیں ہے اور مادہ اور طاقت ازل سے ہی موجود تھے. اب فرض کریں کہ دو ایٹم ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں. کیا نتیجہ کسی اثر کی صورت میں ہو گا؟ جی ہاں. اگر یہ بلکل مختلف سمتوں سے ایک ہی قوت سے آئے تھے تو کم از کم رک ہی جائیں گے. اب یہ فرض کریں کے بالکل ایسے ہی دو ایٹم بالکل ایسے ہی حالات میں

کائنات میں کہیں اور بالکل ایسے ہی آ ٹکرائیں. کیا نتیجہ ہو گا اب؟ بلکل ویسا ہی جو اول الذکر دو ایٹموں کے ٹکراؤ کا تھا. پس ہم نے سیکھا ایک جیسے ہی اسباب ایک جیسے ہی اثر کا نتیجہ دیتے ہیں. یہی قانون ہے اور یہی نظام. ہمارے پاس اب کسی بالائے فطرت ہستی کے بغیر ہی طاقت، مادہ، اثر، نظام اور قانون ہیں. اب ہم جان چکے ہیں کہ ہر اثر کا ایک سبب ہو گا اور ہر سبب کا ایک اثر. کسی ماورائے فطرت ہستی کے لیے بس ایک خالی خلا کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا اور نہ ہی اس کے کرنے کے لیے کوئی کام. اس ہستی کا تخت خالی ہے اور اس کی بادشاہت کسی مادے، کسی طاقت، کسی نظام، کس قانون، کس سبب اور کسی اثر سے عاری ہے.

مگر اس سب مادے کو پھر حرکت میں کس قوت نے ڈالا؟ جواب یہ ہے کہ شاید ہم اپنے پہلے سیکھے ہوئے سبق کو بھول رہے ہیں. اگر مادہ اور طاقت ہمیشہ سے ہی کائنات میں رہے ہیں تو یہ ہمیشہ سے ہی حرکت میں رہے ہوں گے. کیونکہ طاقت بغیر حرکت کے ہو ہی نہیں سکتی. ہم نے پہلے سیکھا تھا کہ مادہ، توانائی اور طاقت سب ایک دوسرے ہی کی مختلف اشکال ہیں. اسی لیے اگر مادہ اور طاقت ہمیشہ سے تھے تو پھر حرکت بھی ہمیشہ سے ہی تھی. اس پوری کی پوری کائنات میں ایک بھی ایٹم ساکت نہیں ہے. فطرت سے بالا کوئی ہستی نہ وجود رکھ

سکتی ہے اور نہ ہے۔ فطرت ہی اس کائنات کے ہر ذرے کو اپنی بیکراں گود میں لے کر چل رہی ہے۔ اس سے باہر کسی ہستی کا تصور ہی مزاح کن ہے۔

کسی ماورائے فطرت ہستی کے وجود کو ثابت کرنے کا اب بس ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ سبب اور اثر کے اس لا متناہی سلسلے کو ایک لمحے کے لیے ہی توڑ دیا جائے۔ کوشش کریں کہ کائنات کے اس عظیم الشان جلوس میں سے کسی ایک ذرے کو بس تھوڑی دیر کے لیے نکال باہر کریں۔ تب ایک فرضی خدا کے نظام میں آپ کے ڈالے ہوئے خلل کی درستگی کے لیے اس خدا کا نمودار ہو جانا لازم ہو جاتا ہے۔ مگر سب جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔

جاہل ترین وحشی کو بھی شاید یہ مذکورہ بالا باتیں معلوم تھیں۔ اسی لیے وہ نبیوں سے معجزوں کا اصرار کرتا تھا۔ ایک مذہب کے بانی کو ایسے معجزے دکھانے پڑتے تھے کہ وہ پانی کو شراب میں تبدیل کر سکے، ایک لفظ سے ہی اندھوں اور معذوروں کو شفا بخش سکے اور مردوں کو بس چھو کر ہی زندوں میں واپس لا سکے۔ اُس نبی کے لیے اُس وقت کے وحشی کو یہ اطمینان دلانا ضروری تھا کہ اُس کا نبی فطرت سے بالاتر ہے۔ جہالت کے وقتوں میں تو نبیوں کے لیے ایسا کرنا آسان تھا۔

وہ وحشی جاہل آسانی سے ہر بات پر یقین کر لیتے تھے. کیونکہ اُن کے لیے کوئی بھی انوکھی چیز شاندار ہوتی تھی اور کوئی بھی پراسرار چیز ضرور کسی عرش بالا سے ہی مظہر ہوئی ہوتی تھی. نتیجتاً ہر مذہب کی بنیاد ایک معجزے پر پڑی، جس کا مطلب ہے فطرت کی خلاف ورزی پر پڑی، جس کا مطلب ہے جھوٹ پر پڑی.

پوری دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی نے بھی کسی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کسی معجزے کا سہارا کبھی نہیں لیا. سچائی تھوکتی ہے معجزوں کی مدد پر. صرف جھوٹ ہی ایسی بیساکھیوں کے سہاروں پر چلنا چاہتا ہے. کسی انسان نے کبھی بھی کوئی معجزہ کبھی نہیں کر دکھایا اور نہ ہی کسی باہوش وحواس انسان نے کبھی یہ سوچا کہ اُس نے کوئی معجزہ کر دکھایا ہے. اور جب تلک کوئی ایسا کر نہ دکھائے تب تلک کسی ایسی قوت کا جو فطرت سے بالا تر اور آزاد ہو بس ایک بھونڈے مذاق کے علاوہ کچھ بھی نہیں.

آج کل کے مذہبی ادارے چاہتے ہیں کہ ہم بس ایمان رکھیں. ذرا ان مذہب کے دلالوں سے بھی تو کوئی یہ کہے کہ جناب کوئی معجزہ کر دکھائیں تو ہم ایمان لائیں ناں. یہ ہمیں کہتے ہیں کہ خدا قادر مطلق ہے اور فطرت اُس کے قابو میں

ہے. ان کو کہیں کہ یہ اس قادر مطلق سے کبھی کوئی ایک چھوٹا سا کام بھی فطرت سے بالاتر کرواکے تو دکھادیں تو ہم سر بسجود ہو کر ایمان لے آئیں گے.

ملا کے خطبے کسی گہرائی، کسی سوچ، کسی تدبر سے عاری بس الفاظ کی شعبدہ بازی ہوتے ہیں. ہمیں اب ان کو بتادینا چاہیے کہ حضور ہم نے آپ میں سے بہترین اذہان کی باتیں بھی سنی ہیں اور آپ کی کتابیں بھی پڑھی ہیں. ہم نے آپ کی دعائیں بھی سنی ہیں، آپ کی بد دعائیں بھی اور آپ کے بیک آواز آمین چلانے کے غوغے بھی. یہ سب کل ملا کر صفر سے زیادہ کچھ بھی نہیں. ہم آپ کے سامنے، آپ کے مقدس پوجاگھروں کے سامنے، باادب باملاحظہ ہو کر، آپ سے بس ایک حقیقت کا مطالبہ کرتے ہیں. اور وہ یہ ہے کہ دکھا دیجئے کوئی نیا معجزہ. آپ جن معجزوں کے گن گاتے رہتے ہیں وہ اب ہزاروں سالوں پرانے ہو کر گل سڑ گئے ہیں. دکھا دیجئے ہمیں کوئی تازہ معجزہ. بنا دیجئے ہم جیسے لوگوں کو اس کا گواہ. ہم ایک نئے معجزے کا ابھی اور یہاں مطالبہ کرتے ہیں. یا تو ایسا کر دیجئے یا پھر انسانیت کی اس گاڑی میں ہمیشہ کے لیے سب سے پچھلی سیٹ پر جا کر خاموشی سے اس کی ترقی کا سفر تکتے رہیے.

پرانے وقتوں میں مذاہب کے یہ بیوپاری فطرت کے قوانین کا مذاق اڑا کر خدا کا وجود ثابت کرتے رہے ہیں. اس زمانے میں معجزے دکھانا ایک انتہائی آسان کام ہوتا تھا. یہ کام اتنا عام ہو چلا تھا کہ مسیحیوں کے چرچ کو تو کم از کم ایک دفعہ اپنے پادریوں کو ایک یاداشت جاری کرنی پڑی تھی جس میں ان کو مزید معجزے دکھانے سے روکا گیا تھا. اب یہی چرچ اصرار کرتا ہے کہ نہ صرف معجزوں کا کوئی وجود نہیں بلکہ سبب اور اثر کا یہ مسلسل سفر ہی خدا کے وجود کا ثبوت ہے. جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی سبب اور اثر کا کارواں خدا کے وجود کی حتمی نفی کرتا ہے. فطرت ہے ہی اسباب اوراثرات کا ایک مستعد سلسلہ. وہ نئ چیز تو تخلیق نہیں کر سکتی مگر اپنے اندر موجود چیزوں کو مسلسل تغیر میں رکھ سکتی ہے اور رکھتی ہے. اور کبھی نہ ختم ہونے والا یہ سفر سدا یوں ہی جاری رہے گا.

مذہبی دنیا میں سے بھی بہترین اذہان یہ تو مانتے ہیں کہ مادی فطرت میں خدا کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ہے. مگر یہ لوگ اس ثبوت کو ذہانت کی خاصیت میں ڈھونڈتے ہیں اور بڑی معصومیت سے کہتے ہیں کہ ذہانت نہ صرف فطرت سے بالا تر ہے بلکہ اس کی مخالف بھی ہے. یہ اصرار کرتے ہیں کہ کم از کم انسان ایک خاص مخلوق ہے اور اپنے دماغ کے کسی حصے میں کہیں اُس اولین آسمانی چنگاری کا

ایک ذرہ لیے پھرتا ہے جب اس کائنات کی تخلیق شروع ہوئی تھی. یہ کہتے ہیں کہ مادہ سوچ نہیں پیدا کر سکتا بلکہ سوچ مادہ پیدا کرتی ہے. یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ چونکہ انسان میں ذہانت ہے تو ضرور اس کی ذہانت سے بھی بالا کوئی ذہانت ہے. چلیں ایک لمحے کے لیے مان لیتے ہیں یہ بات. مگر پھر لازم ہے کہ ہم یہ بھی کہیں کہ چونکہ خدا بھی ذہانت رکھتا ہے تو پھر اس کی ذہانت سے بھی بالا کوئی ذہانت ہو گی کیونکہ یہ زنجیر پھر ٹوٹ نہیں سکتی. جہاں تک ہمیں علم ہے مادہ سے علیحدہ کوئی ذہانت نہیں. ہم کسی ایسی سوچ کا سوچ بھی نہیں سکتے جو دماغ سے باہر سوچی گئی ہو.

وہ سائنس جو ناممکن ذہانت اور نہ سمجھ آنی والی قوتوں کی بات کرتی ہے اس کو مابعد الطبیعات یا علم ذات یا دینیات کہتے ہیں. علم دین کے ماہرین چونکہ سبب اور اثر سے، اور مادے کی خصوصیات سے، بڑی حد تک واقف ہیں اس لیے وہ گھوم پھر کر ہمیشہ انسان کے ذہن پر آجاتے ہیں تاکہ ایک آخری اور افضل ترین طاقت کی بات کر سکیں. مگر ایسا کرتے وقت یا تو یہ بھول جاتے ہیں یا اس بات سے کنی کترا جاتے ہیں کہ انسان کے ذہن میں بھی فطرت ہی کی طرح اسباب اور اثرات کا ایک سسلہ چلتا رہتا ہے. ہر سوچ کا ایک سبب ہوتا ہے. یہ سبب کوئی خوف، امید، جستجو، سوال، خواب یا خواہش کی صورت میں ہوتا ہے جو سوچ کی

صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ پھر تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا خدا کے ذہن میں بھی سوچ کے یہ سارے اسباب موجود ہوتے ہیں؟ یہی سوچ تو انسانیت کو لے کر یہاں تک پہنچی ہے۔ ہاں البتہ اس سوچ کے عدم وجود کو خدا کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ سوچ علم دیتی ہے اور اس کا عدم وجود جہالت۔

اگر ہم اس نظریے کو ترک کر پائیں کہ کسی آسمانی ہستی نے طاقت اور مادہ تخلیق کیا تھا اور پھر اس کو ایک نظام اور قانون دے دیا تھا تو آسمانی دخل اندازی کا خیال بھی منہ کے بل گر پڑے گا۔ حقیقی مولوی تب کسی غیر مرئی قوت کا نہیں بلکہ فطرت کا ترجمان ہو گا۔ اور اُسی لمحے سے مذہبی ادارے اپنی موت آپ مرنا شروع ہو جائیں گے۔ ان آسمانی کتابوں کو اور ان پر چڑھائے گئے زربفت کے غلافوں کو ایسا دیمک لگ جائے گا کہ ایک قلیل ہی عرصے میں یہ سب طوطا مینا کی کہانیاں قصہ پارینہ بن جائیں گی۔

ایک منٹ۔ "مذہبی چلا کر بول اٹھتا ہے۔ "نہ آپ ہر چیز کی وضاحت کر پائے ہیں اور نہ آپ ہر چیز کو سمجھتے ہیں۔ اور جو چیز نہ آپ سمجھ پا رہے ہیں اور نہ واضح کر پا رہے ہیں وہی میرا خدا ہے۔" محترم ذرا سوچیے تو سہی۔ ہر نیا دن ہماری سمجھ میں

اضافہ کر رہا ہے۔ ہر نئے دن ہم پر نئی چیزیں واضح ہو رہی ہیں۔ اسی لیے تو ہر نیا دن آپ کے خدا کا حجم گھٹاتا جا رہا ہے۔ جب کچھ نہیں بن پڑتا تو یہ مذہبی کہتا ہے،"دنیا میں کسی سبب کے بغیر صرف سبب ہی وجود رکھ سکتا ہے۔ اس لیے یہ بے سبب سبب ہی خدا ہے۔"

اس کا ہم پھر جواب دیتے ہیں۔ ہر سبب پر لازم ہے کہ اس کے نتیجہ میں ایک اثر ہو۔ جب تک یہ اثر نہیں پیدا کر سکتا اس کو سبب نہیں کہا جا سکتا۔ ہر اثر پھر ایک سبب بن جاتا ہے۔ اور فطرت میں یہ سلسلہ سدا یوں ہی بغیر کسی آخری نکتے کے چلتا رہتا ہے۔ کیونکہ آخری سبب نے بھی ایک آخری اثر پیدا کرنا ہوتا ہے اور اس آخری اثر نے پھر ایک اور آخری سبب۔ اسی لیے فطرت میں نہ کوئی پہلا اثر ہو سکتا ہے نہ کوئی آخری سبب۔ اس کائنات سے باہر کچھ بھی نہیں۔ اور اس کائنات کے اندر مافوق الفطرت ہستی کا وجود نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہے۔

جس لمحے ان عظیم حقائق کو سمجھ کر سچ مان لیا جاتا ہے اسی لمحے سے ان مقدس آسمانی روحوں میں ایمان رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی لمحے سے انسان ان غیر مرئی قوتوں کو خوش رکھنے کی کوششیں چھوڑ کر دنیاوی معاملات میں دلچسپی لینا

شروع کر دیتا ہے۔ دعاؤں اور نمازوں پر اس کا انحصار ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں سے غیر یقینی کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے۔ اُس کو ایک ایسا سکون حاصل ہو جاتا ہے جو توہمات پر ایمان رکھنے والوں کو کبھی نہیں مل پاتا۔ اس کے مستقبل کے منصوبے اب اس کی اپنی محنت اور کاوش سے ہی پھل دیں گے۔ ان کی کامیابی کے لیے اب اُسے کسی قادر مطلق کی خوشامد نہیں کرنی پڑے گی۔ پوری کی پوری قوموں کو ان آسمانی روحوں سے اسی طرح نجات مل جائے گی۔ مذاہب کی نفرتوں اور دھمکیوں سے آزاد سائنس اب دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے گی۔ انسانی ذہن کسی مضمون پر اپنی تحقیق کسی تقدس کو مد نظر رکھے بغیر کرے گا اور اُس کے نتائج بلا خوف نشر کرے گا۔ فلکیات، ارضیات، غرضیکہ تمام علوم میں، انسان ان خداؤں کی دی ہوئی غلط تعلیم کی تصحیح کرے گا۔ جیسے ہی مذہبی اداروں کا خوف انسانیت کے سروں پر سے اُٹھ جائے گا، لاکھوں لوگ اپنے خیالات اور مفروضات پر کھل کر کام کرنا شروع کر دیں گے۔ انسانیت کی فتح تب عالمی بھی ہو گی اور حتمی بھی۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ یہ غیر مرئی قوتیں ہی فرد واحد کی اور قوموں کی قسمتوں کا تعین کرتی رہی ہیں تو تاریخ ایک بھیانک مذاق بن جاتی ہے۔ ہر دور میں طاقتور

کمزوروں کو کچلتے رہے ہیں اور مکار اور عیار لوگ سادہ لوح انسانوں کو اپنے دام میں پھنسا کر غلام بناتے رہے ہیں. اسی پوری دنیا کی لاکھوں سالوں کی تاریخ میں کبھی ایک دفعہ بھی ان خداؤں نے کمزوروں کی کوئی مدد نہیں کی. انسان کو اب اوپر کی امداد پر اپنا انحصار ختم کر دینا چاہیے. اب تک اس کو اندازہ ہو جانا چاہیے کہ ان طاقتوں کے پاس نہ تو سننے والے کان ہیں اور نہ ہی مدد کرنے والے ہاتھ. اس کا حال اس کے ماضی کی ہی اولاد ہے. ماضی میں کبھی بھی نہ کوئی اتفاقیہ کام ہوئے ہیں اور نہ ہی کبھی اوپر سے کوئی دخل اندازی. انسانیت کی ہر کامیابی، ہر جستجو، ہر کوشش، ہر نصرت، ہر کامرانی کا انحصار اب حضرت انسان کی اپنی ہی جہد مسلسل پر ہے.

جہاں تک ہم نے فطرت کا مشاہدہ کیا ہے یہ اپنے اندر کے مسلسل تغیر کو بغیر کسی جانب داری کے جاری رکھے ہوئے ہے. نہ یہ کسی کے لیے روتی ہے اور نہ ہی کسی کے لیے خوشیاں مناتی ہے. یہ انسان کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کرتی ہے اور بغیر کسی افسوس کے فنا کر دیتی ہے. اس کو نقصان دہ اور فائدہ مند کا فرق نہیں پتہ. زندگی اور موت، دکھ اور خوشی، زہر اور تریاق، آنسو اور مسکراہٹ اس کے لیے سب ایک برابر ہیں. نہ یہ رحمدل ہے اور نہ ہی ظالم. اس کی نہ خوشامد کی جا

سکتی ہے اور نہ ہی اس کا دل آنسوؤں سے پگھلایا جا سکتا ہے. یہ دعاؤں اور نمازوں سے نا آشنا ہے. اس کو انسانوں کے دلوں میں رحم کے جذبے اور سانپوں کے دانتوں میں زہر کے درمیان تمیز کرنا نہیں آتا. صرف انسان کے آنکھ سے ہی یہ سچائی، اچھائی اور خوبصورتی کو پہچان پاتی ہے. اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انسان فطرت کی ذہین ترین مخلوق ہے.

اس کے باوجود انسان ابھی تک ان آسمانی خداؤں کے چکر میں پھنسا ہوا ہے. اور دن رات نمازوں، دعاؤں، منافقتوں اور قربانیوں سے ان کی خوشامد میں مصروف رہتا ہے. اس کی بہترین کاوشیں ان آسمانی روحوں کی خدمت میں خرچ ہو جاتی ہیں. اچھائی اور برائی کی پہچان نے اس کو ایک ایسے خدا اور شیطان کا تصور بنانے پر مجبور کیا جو کائنات کا نظام حسب ضرورت درہم برہم کر سکتے تھے. مذاہب کی تاریخ بس انسان کی انہی کوششوں کے بارے میں ہے کہ کیسے خداؤں کو خوش اور شیطانوں کو دور رکھا جائے. ڈرتا تو خیر وہ دونوں سے ہی تھا. اس کیلئے شیطان کی مکروہ ہنسی اور خدا کے ماتھے پر بل ایک برابر تھے. بہرحال، انسان کی قسمتوں کی مالک یہی آسمانی روحیں تھیں. جب تک انسان ان عقیدوں کی زنجیروں کو توڑ نہیں دیتا تب تک انہی روحوں کی غلامی میں جکڑا رہے گا جو اس کو

آزادی نہ تو اس دنیا میں دیتی ہیں اور نہ ہی اُس دنیا میں.

انسان کو بس اپنی مدد آپ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے. کسی مقدس کتاب کی تلاوت آپ کو یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑوں سے نہیں بچا سکتی. مگر گھر، گرم کپڑے اور آگ کی تپش ضرور بچا لے گی. لاکھوں وعظ بھی آپ کو قحط سے نہیں بچا سکتے مگر کسان کا ہل بچا سکتا ہے. انسانی تاریخ کی تمام دعائیں بھی اکٹھی کر لیں تو وہ ایک بیمار کے لیے وہ کام نہیں کر سکتیں جو پنسلین کا ایک ٹیکا کر سکتا ہے.

اگرچہ بہت سی ممتاز شخصیات نے کوششیں کر لیں کہ کسی طریقے سے خود اختیاری اور قسمت، شیطان کے وجود اور خدا کی قدرت اور اچھائی میں ہم آہنگی لا سکیں مگر خوش سلیقہ، اور بظاہر عالمانہ، ناکامیوں کے سوا کچھ نہ ملا. جبکہ فطرت اور اس کے انسان اور حقیقتوں کے ساتھ رشتے کو سمجھنے والے لوگوں کو کفر، الحاد اور طعنہ زنی کی مہریں لگا کر دھتکار دیا گیا. پوری دنیا میں ان آسمانی مذاہب کے ادارتی نمائندے سائنسدانوں اور فلسفیوں کی آوازوں کو پوری طاقت کے ساتھ دبانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں.

جاہلیت کے ادوار میں اندھا ایمان بلا روک ٹوک حکومت کیا کرتا تھا.

مندروں، گرجاگھروں اور مسجدوں میں انسان گھٹنوں کے بل جھکے نظر آتے تھے. ان کی دولتوں سے یہ بے شمار پوجا خانے سونے اور چاندی سے سجے ہوئے ہوتے تھے. عظیم مصور مجبور تھے کہ ان خداؤں کی شبیہوں پر ان پوجاگھروں میں اپنا وقت ضائع کریں. بڑے بڑے شعراء کو اپنے کلام میں ایمان والوں کے خداؤں کو جلا بخشنا پڑی. ایمان کے ایک اشارے پر ہی دھرتی کو خون سے نہلا دیا جاتا تھا. انصاف کے ترازو ایمان والوں کے مال و دولت سے ان کی طرف جھکے جاتے تھے. دردناک اذیتوں کے لیے ایمان والوں نے حیرت انگیز آلات تیار کر رکھے تھے. ایمان نے ان خداؤں کے لیے عالیشان مندر بنائے اور انسانوں کے لیے خوفناک عقوبت خانے. ایمان نے آسمانوں کو فرشتوں سے مزین کر دیا اور زمین کو غلاموں سے. صدیوں تک یہ دنیا اس ایمان کی سرداری میں مسلسل ان المناک ادوار کی طرف پیچھے جاتی رہی ہرچند کہ کچھ لادین رک جانے کے لیے چیختے رہے. کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انسان کی سوچ بندشوں سے آزاد ہو کر ہی اپنی صلاحیتیں دکھا سکتی ہے. خوف سے ماؤف ذہن صرف سجدے میں گر جانے کا ہی مشورہ دے سکتا ہے.

جو قومیں آج بھی ہر سوال کا جواب 'خدا' کے لفظ میں ڈھونڈتی ہیں ان کے

لیے سائنسی تفتیش ناممکن ہے. اسی طرح قوموں کے عروج وزوال کو بھی 'اللہ کی مرضی' میں ڈھونڈنا پرلے درجے کی خام خیالی ہے. ایسی سوچ اسباب ڈھونڈنے کی بجائے جہالت اور تعلیم کو برابری کی سطح پر لا کھڑا کرتی ہے. فلسفیانہ نکتہ نظر سے سائنس زندگی کے قوانین، انسانی خوشحالی اور ہمارے ارد گرد کے حالات کے علوم کا نام ہے. سائنس کا کام ہی فطرت کو انسانی ذہن کے طابع کرنا اور ذہن ہی کی طاقت سے فطرت کو انسانیت کے کام میں لانا ہے.

کسی بالائی قوت پر انحصار نہ صرف تفتیش کی روح کو مار دیتی ہے بلکہ انسانی کوشش کو بھی ناکارہ کر چھوڑتی ہے. جب کسی نے اپنے آپ کو ایک ایسی قوت کے رحم و کرم پر چھوڑا ہی ہوا ہو جو ایک لمحے میں آپ کو جنت کے باغوں سے اٹھا کر دوزخ کی نچلی ترین بھٹیوں میں پہنچ سکتی ہو تو انسان کیوں خدا کے نظام میں دخل انداز ہو؟ جب تک ایسا یقین عام تھا تب تک یہ دنیا جہالت، توہمات اور مصائب میں گھری ہوئی تھی. انسان بجائے تفتیش و تحقیق کے اپنی تمام تر توانیاں ہمہ وقت عبادتوں اور دنوں پر محیط لمبی لمبی رسومات کی ادائیگی میں ہی صرف کر دیتا تھا. بے شمار صدیوں تک تو انسان انسانوں کو ہی ان آسمانی دیوتاؤں کے منبروں پر قربان کرتا رہا تھا. ان کو خوش کرنے کے لیے ماؤں نے اپنی اولادوں کی

قربانیاں دیں، جوان لڑکیوں نے اپنی جوانیاں ان کو وقف کر دیں، زندگی کی بہاروں میں نوجوانوں نے شہادت کے جام نوش کیے اور بوڑھے تا دم مرگ کانپتے ہاتھوں سے تسبیحیں الٹتے رہے. انسانیت نے ہر درد، ہر اذیت، ہر صعوبت ان آسمانی طاقتوں کو خوش رکھنے کے لیے جھیلیں.

ان پچھلی تاریک صدیوں میں انسانیت نے مذہب کے ہاتھوں ناقابل یقین تشدد برداشت کیا. سب سے بڑی قیمت معصوموں، کمزوروں اور محبت کرنے والوں نے ادا کی. عورتوں کے ساتھ جانوروں والا سلوک کیا گیا. بچوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح کچلا گیا. قربان گاہوں کو دودھ پیتے بچوں کے خون سے سرخ کیا گیا. محبت کرنے والوں کو سرعام سنگسار کیا گیا. خوبصورت دوشیزاؤں کو زہریلے ناگوں کے سامنے پھینکا گیا. پوری کی پوری قوموں کو عمر بھر کی غلامی میں ڈال دیا گیا. یہ سب لاچار، مجبور اور بے کس انسان ان خداؤں سے رو رو کر، چلا چلا کر مدد مانگتے رہے مگر یہ بے حس خدا مکمل طور پر اندھے اور بہرے بنے رہے.

یہ تو کہنا کافی نہ ہو گا کہ کسی خدا نے یہ دنیا تخلیق کی، اس کے قوانین بنائے اور پھر اپنی مخلوق کو زندگی کی جنگ لڑنے کے لیے کمزور، تنہا اور بے خبر چھوڑ کر چند

اور معاملات میں دلچسپی لینے لگا. یہ بھی کہنا کافی نہیں کہ کسی اور دنیا میں یہ خدا اپنے کچھ، یا چلیں سب لوگوں کو، بھرپور خوشیاں دے گا. ہم کیسے مان لیں کہ یہ علیم، رحیم اور قادر قوت جو سلوک ہمارے ساتھ آج کر رہی ہے، یا ماضی میں کرتی رہی ہے، آیندہ کبھی اس سے کچھ بہتر کرے گی؟ اگر یہ ایک قادر مطلق کی ہی تخلیق کی ہوئی ہے تو یہ دنیا تو خامیوں سے بھری پڑی ہے. پھر ہمیں کیسے یقین کر لیں کہ اس کی آیندہ کی وعدہ کی ہوئی دنیا اس سے بہتر ہو گی؟ اگر یہی ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا خدا آج اپنے بچوں کو ایسی کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر ٹس سے مس نہیں ہوتا تو کیا ضمانت ہے کہ آیندہ ان کو ایسے ہی بلکتا ہوا نہیں چھوڑ کر جائیگا؟ کیا تب خدا کے پاس مزید طاقت ہو گی؟ کیا وہ تب اچانک ہی زیادہ رحمدل ہو جائے گا؟ کیا تب اس کی اپنی بے کس مخلوق کے لیے محبت زیادہ ہو جائے گی؟ کیا خدائے بزرگ و برتر کے سلوک میں بھی بہتری آسکتی ہے؟

ہمیں ملا بتاتا ہے کہ یہ دنیا ایک کمرہ امتحان کی طرح ہے، کہ ہمارے ارد گرد کی بدیاں خدا نے ہماری روحوں کی تربیت کے لیے پھیلائی ہوئی ہیں اور انسان صرف مصیبتوں سے گزر کر ہی خالص، نیک، مضبوط اور عظیم بن سکتا ہے. اگر یہ سچ مان لیا جائے تو اُن بچوں کا کیا بنے گا جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں؟ اس طرح تو اُن کی

روحوں کو تربیت کی مہلت ہی نہیں ملی. کیونکہ ایسے بچوں کو درد اور مصیبت کی آشنائی ہی نہیں مل سکی. اگر ملا صحیح کہتا ہے تو خوشحال لوگوں سے زیادہ بدقسمت اور بدحال لوگوں سے زیادہ خوش قسمت کوئی نہیں. اگر اس زندگی میں بدی انسان کی روح کی تربیت کے لیے اتنی ہی ضروری ہے تو بدی سے خالی جنت میں اس کی روح کی مزید تربیت کیسے ہو گی؟

ملا پھر گھوم پھر کر 'تخلیقیت' پر آ جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ خدا کے وجود کا حتمی ثبوت ہے. وہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ یہ دنیا، اوراس میں جو کچھ بھی ہے، اسی طرح تخلیق کی گئی تھی. وہ سکھاتا ہے کہ یہ پھول، پتے، درخت، انسان، حیوان اور چرند پرند سب کے سب ایک خاص تخلیق ہیں اور ان کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے. چند ان میں سے اتنا مان لیتے ہیں کہ شاید سمندر بھی کچھ زمین میں گُھس آیا تھااور زمین بھی کچھ سمندر میں گر گئی تھی. اور شاید آج کے پہاڑوں کی اونچائی بلکل وہی نہ ہو جو تخلیق کے لمحے تھی. ہمارے آباواجداد کو ارتقاء کا کوئی ادراک نہیں تھا. زمین اُن کو تازہ تازہ کسی خدا کی بنائی ہوئی لگتی تھی. اُن کو سست رفتار ارتقاء کا، جو لاکھوں سالوں پر محیط ہو، کوئی بھی علم نہیں تھا. اور اس کا شاید اُن کو اس لیے بھی قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ ارتقاء کے عمل کا ایک ہی

نشست میں مشاہدہ ممکن ہی نہیں۔ اسی لیے وہ ہر چیز کی تخلیق و ترتیب و تشکیل کو ازلی ہی سمجھتے تھے۔

چلیے ارتقاء اور 'تخلیقیت' کو سمجھتے ہیں۔ فرض کرتے ہیں کہ ایک جزیرے پر ہمیں ایک انسان ملتا ہے جس کی عمر دس لاکھ سال ہو اور جس کے پاس ایک ایسی گاڑی ہو جو ہر لحاظ سے صناعی کا بہترین نمونہ ہو۔ اور مزید یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ شخص ہمیں بتائے کہ اس کی گاڑی کئی لاکھ سالوں کی سوچ اور محنت کا نتیجہ ہے۔ پہلے وہ صرف چپٹے شہتیر استعمال کرتا تھا۔ پچاس ہزار سال تو اُس کو صرف اس بات کی جانکاری میں لگے کہ اگر انہی شہتیروں میں سے تختے نکال لیے جائیں تو نہ صرف گاڑی کا وزن کم ہو جائیگا بلکہ سامان وغیرہ لادنے کے لیے ہموار سطح بھی زیادہ مل جائیگی۔ پھر اگلے کئی ہزار سال پہیہ ایجاد کرنے میں لگے اور اُن سے اگلے پچاس ہزار سال اُسی پہیے کو مزید بہتر بنانے میں۔ پھر ہزاروں مزید سالوں میں اسی طرح کی اور چھوٹی بڑی بہتریاں لاکر وہ انسان اس گاڑی کو موجودہ شکل میں لا پایا تھا۔ تو کیا ہم اُس انسان کے بارے میں یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ وہ روز اول سے ہی ایک بہترین بڑھئی اور مستری تھا؟ ایسے ہی بالفرض ہم اُس انسان کو ایک شاندار محل میں رہتے ہوئے پاتے۔ اور وہ ہمیں بتاتا کہ کتنے ہزار سالوں

میں اُس نے پتھر کو تراشنا سیکھا. پھر ان تراشے ہوئے پتھروں کو کتنے ہزاروں سالوں میں دیواروں میں لگانا سیکھا اور کتنے ہزار سالوں میں ان دیواروں پر چھت بنانا سیکھی. اور مزید کتنے ہزار سالوں میں اُس نے کھڑکیاں اور دروازے بنانے سیکھے. تو کیا ہم اُس کے بارے میں یہ کہہ سکیں گے کہ یہ شخص تو پہلے دن سے ہی ایک بہترین معمار تھا؟ کیا اب یہ سمجھنا مشکل ہے کہ تخلیق کو اس کے خالق بتدریج ہی بہتر کرتے ہیں. اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ یہ بتدریج بہتری اس کے خالق میں بھی بتدریج بہتری لاتی ہے؟ ارتقاء اور 'تخلیقیت' کی بس اتنی سی بات تھی.

اب ایک اور بات سوچیں. آپ ایک ایسے شفیق باپ کے بارے میں کیا کہیں گے جو اپنے عزیز بچوں کو ایک باغ تحفے میں دے مگر دینے سے پہلے اس میں ہزاروں خاردار اور کانٹادار جھاڑیاں لگادے، خونخوار درندے اور زہریلے سانپ چھوڑ دے، اُس باغ کے چند تالابوں میں ملیریا کے جراثیم ڈال دے اور ادھر اُدھر چند آتش فشاں پہاڑ بھی کھڑے کر دے جو اُس کے بچوں کو وقتاً فوقتاً جلا کر بھسم کر سکتے ہوں؟ اور اب یہ باپ اپنے بچوں کو یہ بھی نہ بتائے کہ کون کونسے درخت زہریلا پھل دیتے ہیں، ملیریا سے کیسے بچنا ہے، آتش فشانوں سے بچاؤ

کیونکر ممکن ہے اور سانپوں کے زہر کا تریاق کیا ہے. یہ سب کچھ وہ اپنے بچوں پر ہی چھوڑ دے کہ وہ جانوں کا نذرانہ دے کر یہ تمام سبق سیکھیں. کیا ہم ایسے باپ کو اُن بچوں کے لیے ایک فرشتہ سمجھیں گے یا انکا بد ترین دشمن؟

اس کے باوجود مذہبی لوگ ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیا بہترین اور بے نقص ہے. لیکن پھر اُسی سانس میں ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ دنیا مصیبتوں، دکھوں، تکلیفوں اور آزمائشوں کا گھر ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ ہم سب کی اماں بی بی حوا نے خدا کے حکم کہ خلاف ایک سیب کھالیا تھا.

میرا ایک انتہائی نیک دوست میری یہ بات سن کر بڑا حیران ہوا کہ یہ دنیا خامیوں سے بھری پڑی ہے. میری اس 'احمقانہ' سوچ کا اُس کو بہت 'دکھ' پہنچا. مجھے کہنے لگا، "مہربانی فرما کر اس بھری دنیا میں کوئی ایک چیز ایسی دکھا دیجیۓ جس میں آپ کوئی بہتری لا سکتے ہوں." میں نے جواب دیا، " میں بیماریوں کی جگہ صحت کو عام کر دیتا." حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کے تمام دکھوں، دردوں اور مصیبتوں کو ایک ایسے قادر مطلق خدا کے ساتھ جو ہم سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار بھی کرتا ہو ہم آہنگ کرنا نا ممکن ہے.

مذہبی فرقہ، بہر حال اس دنیا کی تمام فی الوقت موجود بدیوں، برائیوں اور مشکلات کو اگلی دنیا کی متوقع خوشحالی کے ساتھ برابر کر دیتا ہے. ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ وہ دنیا بے نقص ہے، وہاں آسمان ہمیشہ نیلا رہے گا اور چہار جانب امن و چاشنی کا دور دورہ ہو گا. یہاں پر بادشاہتیں اُلٹ سکتی ہیں، لاکھوں لوگ بے رحم کوڑوں اور تپتے سورج کی چلچلاتی دھوپ کے نیچے غلامی کی زندگیوں میں پِس سکتے ہیں، مگر اُس دنیا میں صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی. یہاں پر وبائیں لاشوں کے انبار لگا دیں، بچے بھوک سے بلک بلک کر دم توڑ دیں، معصوم لوگ طاقتوروں کے تہہ خانوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر فنا ہو جائیں، مگر وہاں صرف ہمہ وقت دل ربا نغمے، لازوال شادمانی اور خدا کی شفیق مسکراہٹیں ہوں گی جو دنیا کے تمام دکھ درد بھلا دیں گی.

ابھی تک آپکو یہ دکھایا ہے کہ انسان نے کیسے خدا تخلیق کیا اور پھر کیسے کانپتے بدن کے ساتھ خود ہی اُس خدا کی غلامی میں چلا گیا. اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیسے اس آسمان کے جابر شہنشاہ سے اپنی تھوڑی بہت جان چھڑا پایا ہے؟ آخر کیسے اس خوف، وہم اور جہالت کے طوق کو پھینک کر یہاں تک پہنچ پایا جتنا بھی یہ سفر ہے؟

شاید سب سے پہلی چیز جس نے اس کے ذہن کو جھنجوڑا وہ تھی اس کائنات میں ہر شے اور واقعے کے باقاعدہ، منظم اور میعادی وقفوں پر ہونے کی دریافت تھی. اس سے اُس کو شک پڑا کہ شاید کائنات میں ہر چیز اُس کی ذات کے حوالے سے نہیں ہوتی. اُس نے مشاہدہ کیا کہ وہ چاہے جو بھی کرلے سیاروں کی گردش ویسی ہی رہتی ہے. گرہن اُسی میعاد اور اتنے ہی وقفے سے لگتے ہیں. یہاں تک کہ دُمدار ستارے بھی اُسی انداز سے آتے اور جاتے رہتے ہیں. اس سے اُس نے اندازہ لگایا کہ گرہنوں کا اور دُمدار ستاروں کا اُس کی ذات اور اُس کے ذاتی چال چلن سے کوئی تعلق نہیں. جب اُس نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ اُس کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کے لیے نہیں ہوتا تو انہی ستاروں، سیاروں اور گرہنوں سے ڈرنے کی بجائے ان کی ستائش کرنے لگا. اس کو یہ بھی شک پڑنے لگا کہ قحط کسی قہار اور منتقم خدا کے بھیجے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ انسان کی اپنی ہی غفلت کا نتیجہ ہوتے ہیں. اسی طرح اس نے وباؤں اور بیماریوں کو بھی ان خداؤں کے کھاتے میں سے نکال دیا. آہستہ آہستہ اُس نے یہ بھی جان لیا کہ دوا، دعا سے بہتر کام کرتی ہے. اس کو یہ بھی شک پڑنا شروع ہوگیا کہ یہ خدا اُس وقت تک اس کے کسی کام کے نہیں ہوتے جب تک یہ خود اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہ ہو.

آخر کار حضرت انسان یہاں تک بوجھ گیا کہ اُس کے ذاتی عمل کے برا یا اچھا ہونے سے نہ ہی سمندروں میں طغیانی آتی ہے اور نہ ہی رکتی ہے. اور اُس کے کسی پیر، مولوی یا عالم دین کے منہ چڑانے سے زلزلے نہیں آتے. ایک اور حیران کن بات جو اُس کے مشاہدے میں آئی وہ یہ تھی کہ کبھی کبھار انتہائی نیک لوگ بھی آسمانی بجلی کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ نابکار لوگ اکثر صاف بچ نکلتے ہیں. سب سے دردناک بات اُس پر یہ آشکارہ ہوئی کہ حق ہمیشہ نہیں جیتتا اور یہ خدا کمزوروں کی مدد کم اور طاقتوروں کی کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں.

کبھی کبھار اُس انسان نے ملحدوں کو بھی خوب تندرست و توانا پایا. آہستہ آہستہ وہ اس نتیجے پر پہنچ ہی گیا کہ سخت جاڑے کا مولوی کو کالے بکرے کا نذرانہ نہ دینے سے کوئی تعلق نہیں. اُس کو شک ہونا شروع گیا کہ کائنات کا نظام اس کی تسبیحیں اُلٹنے سے نہ رکتا ہے اور نہ ہی چلتا ہے. اُس نے دیکھا کہ باوجود اس کے کہ اُن کے کانوں میں پیدا ہوتے ہی اذان دے دی جاتی تھی، کچھ بچے ہوش سنبھالتے ہی چوریاں کرنی شروع کر دیتے تھے. اُس نے مذہب اور انصاف میں ایک بہت بڑا فرق دیکھنا شروع کر دیا. اُس نے مذہبی نفرتوں کو پروان چڑھتے دیکھا. اُس نے ایک ہی خدا کے بچوں کو خوشی خوشی ایک دوسرے کو ذبح کرتے

دیکھا۔ آخر کار وہ اتنا سوچنے کی ہمت کر سکا کہ اگر کوئی خدا ہے بھی تو وہ اس دنیا کے نظام میں دخل نہیں دیتا۔ اُس نے جو کچھ سیکھا وہ اُس کے آباواجداد کے عقیدوں سے بالکل جدا تھا۔ اُس نے اپنی مقدس کتابوں کو بجاے مولوی کے منہ سے سننے کے جب خود پڑھا تو جا بجا جھوٹ لکھا نظر آیا۔ نہ صرف اُس کو اُن کے آسمانی ہونے پر شک ہونے لگا بلکہ اُن مولویوں کی بھی اس کے دل سے عزت جاتی رہی جو اس کو ایسا بتاتے رہے تھے۔ یہ انسان کی شعوری آزادی کی شروعات تھیں۔

انسان کی تہذیب بس اتنی ہی آگے جا سکی ہے جتنا مذہب پیچھے ہٹا ہے۔ انسانی ترقی کا راز ہی اب اس حقیقت میں ہے کہ ہر نئے آنے والے دن میں کسی پرانے وہم کو کسی نئی سچائی سے تبدیل کر دیا جائے۔ مذہبی اداروں نے کبھی بھی انسان کے اس عمل میں کوئی مدد نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس مذہب کے تاجروں نے اس عمل میں ہر ممکن رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کی ہیں۔ انسان نے اپنی مقدس کتابوں میں خود ہی پڑھ لیا کہ اس کے مصنف کے خیالات بدترین وحشی کے خیالات سے بھی زیادہ ظالمانہ ہیں۔ انسان نے خود ہی دریافت کر لیا کہ یہ کتابیں جہالتوں سے بھری پڑی ہیں جو ان کے لکھنے والوں کی گنوار حالت کا صاف پتہ دیتی

ہیں۔ کبھی کبھار کوئی باہمت انسان ان کے بارے میں سچ کہہ ہی ڈالتا تھا۔ ہر دور میں ایسے معدودے چند لوگ گزرے ہیں جو سچ کے شیدائی تھے، بیباک سوچ رکھتے تھے، منافقت کے مخالف تھے اور اتنے بہادر تھے کہ بے لاگ بات کر سکیں۔ ان لوگوں نے انسانیت اور سچائی کی بقاء کی خاطر مذہب کے جلادوں کے بے انتہا مظالم سہے۔ خدا کے پجاریوں نے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا۔ حد تو یہ ہے کہ مذہب کے غنڈوں نے خود عیسیٰ کو توہین خدا کی سزا میں صلیب پر چڑھا دیا۔ ایک مذہبی کو اس سے زیادہ کوئی کام نیک نہیں لگتا کہ اپنے خدا کی خوشنودی کے لیے اُس کے دشمنوں کا قتل عام کرے۔ مذہبی تشدد کا جنم ہی خدا کی محبت اور انسان سے نفرت سے ہوتا ہے۔

پھر مذہبی جنگوں نے، جن میں لاکھوں لوگ لقمہ اجل بنے، انسان کے دل میں مذاہب کے خلاف مزید حقارت پیدا کر دی۔ سوچنے والوں نے ایسے خداؤں کے نفرت بھرے آسمانی پیغاموں پر سوال کرنے شروع کر دیئے۔ جب انہی میں سے چند لوگوں نے اپنے پیدائشی مذاہب کا زمانہ جاہلیت کے مذہبوں کے ساتھ موازنہ کیا تو معلوم پڑا کہ اول تو کوئی زیادہ فرق تھا ہی نہیں اور اگر کچھ تھا بھی تو اتنا نہیں تھا کہ اُس کی خاطر اپنی جانیں قربان کی جائیں۔ پھر اُنہیں یہ بھی پتہ چلا کہ

چند اور قومیں تو ان سے بھی زیادہ خوشحال رہ رہی ہیں۔ اُن کا شک پکا ہونا شروع ہو گیا کہ ان کے مذہب میں ایسی بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔

مسیحی مذہب کو ہی لے لیجئے۔ تین سو سال تک مسیحی فوجیں عیسیٰ کے مزار کو لادینوں کے چنگل سے چھڑوانے کی کوششیں کرتی رہیں اور مسلسل مار کھاتی رہیں۔ لاکھوں نصرانیوں کا اپنے ایسے خدا پر سے اعتماد اٹھنا شروع ہو گیا جو مسلمانوں کے خدا سے مار کھاتا رہتا ہو۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں مذاہب دشمنیاں جنم دیتی ہیں وہاں تجارت دوستیوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ جو بھی ان خداؤں سے شدت سے محبت کرتے ہیں وہ انسانوں سے اُتنی ہی شدت سے نفرت کرتے ہیں۔ اور یہ کہ عالم گیر معافی کا مسیحی تصور تکبر اور مذاق کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سب سے کینہ پرور لوگ بڑی ڈھٹائی سے اپنے دشمنوں کی خیریت کے لیے دعائیں بھی مانگتے تھے اور موقع ملنے پر بجائے معاف کرنے کے ان کے گلوں پر چھریاں بھی پھیر دیتے تھے۔ انسان جان گیا کہ مذہب ہی وہ درخت ہے جس کا نام تو عاجزی ہے مگر پھل ظلم اور جبر ہیں۔

صدیوں سے معدودے چند بہادر دانشوروں اور لاتعداد مذہبی جاہلوں کے

درمیان ایک خونی کشمکش جاری رہی ہے. یہ سائنس اور اندھے اعتقاد کے درمیان جنگ ہے. وہ چند لوگ دلیل، عقل، دنیاوی قانون، معلوم پر یقین اور یہیں کی خوشیوں کی بات کرتے ہیں. جبکہ دوسرے ہاتھ پر بے شمار مذہبی لوگ تعصب، خوف، معجزوں، غلامی، غیب اور نامعلوم پر اندھے یقین اور کسی اور عالم کی متوقع خوشیوں کی بات کرتے ہیں. چند کہتے ہیں 'سوچو' اور لاکھوں کہتے ہیں سوچو مت، "ایمان" لاؤ.

پہلا شک وہ پہلی کوکھ اور پہلا پالنا تھا جس میں سے انسان نے ترقی شروع کی. انسان نے تفتیش شروع کی اور مذہب نے مزاحمت. ماہرین نجوم نے آسمانوں کو کھنگالنا شروع کیا اور مذہب نے اُن کی کشادہ پیشانیوں پر لفظ 'کافر' داغنا. مذہب کی مخالفت کے باوجود ماہرین ارضیات کرہ ارض کا سینہ چیر کر اندر گھس گئے. وہاں، اس کی تہوں اور چٹانوں پر لکھی ہوئی اس کی تاریخ کی ہزاروں سالوں پر محیط داستانیں پڑھ ڈالیں. دقیانوسی خیالات کیمیا دانوں کی لیبارٹریوں میں دم توڑتے چلے گئے. ایک ایک کر کے مذہبی نظریات کو سائنس کی کھٹالی میں ڈالا گیا اور ایک ایک کر کے ان میں سے کھوٹ کے سوا کچھ نہ نکلا. خوردبینوں کے نیچے نئی دنیائیں دریافت کر لی گئیں اور دوربینوں کی آنکھوں سے آسمانوں کے راز.

چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے ستارے تک ہر جگہ فطرت ہی فطرت نظر آئی. کہیں بھی کسی مافوق الفطرت ہستی کے قدموں کی مدھم سی چھاپ بھی نہیں مل پائی. یہ وہ شاندار سچائیاں ہیں جنہوں نے انسان کو توہمات کا طوق اتار پھینکنے کے قابل بنایا. یہ وہ عالیشان حقیقتیں ہیں جنہوں نے ملا کے ہاتھوں سے کلی اختیار چھین لیا.

آج ماضی کے وسیع مقبرے میں انسان کے بہت سارے مذاہب اور خداؤں کی ہڈیاں مدفون ہیں. ہندوستان کے مقدس مندر تو کب کے ویران پڑے ہوئے ہیں. ان کی فصیلوں، منقش دیواروں اور ستونوں پر آج خودرو بیلیں راج کر رہی ہیں. چار سروں اور چار ہاتھوں والا سنہرا براہما، سزائیں دینے والا، تین آنکھوں، چاند اور کھوپڑیوں کے ہار والا تاریک وشنو، تباہ کرنے والا خونوں خون شیوا، کالی ماتا، کرشنا اور ایسے ہی لاتعداد اور خدا اب تاریخ کے اوراق کا حصہ بن چکے ہیں. روتی دیوی ایسس نے اب مقدس نیل کے کناروں پر مرے ہوئے اوسیرس کی تلاش چھوڑ دی ہے. یونانی خدا ٹائیفون کی تیوریاں اب سمندروں کی لہروں پر اثر انداز نہیں ہوتیں. سورج اب بھی اُسی طرح نکلتا ہے مگر ممنان اور ابوالہول خاموش کھڑے ہیں. مصر کی گرد آلود ممیاں آج بھی اپنے پادریوں کی وعدہ کی

ہوئی دوسری زندگی کے انتظار میں پڑی گل سڑ رہی ہیں. فارس اور ازٹک کی مقدس آگ بجھ چکی ہیں. وینس کب کی اپنی محبتوں کے ساتھ ہی فنا ہو چکی ہے. جھرنے اب بھی گنگناتے ہیں مگر جل پریاں پتہ نہیں کہاں غائب ہو گئی ہیں. شہر اولمپس کے خدا پتہ نہیں کہاں اڑ کر چلے گئے ہیں. اب تو خوبصورت دوشیزائیں بھی ان کو واپس نہیں بلا پاتیں. دیوی ڈائنا اب ننگ دھڑنگ خاموش ستاروں کے نیچے کھڑی رہتی ہے. کوہ سینائی کسی نئے موسیٰ کا چپ چاپ انتظار کر رہا ہے. وہاں اب کسی پیغمبر کی آوازیں آنا بند ہو گئی ہیں. ایک ایک کر کے یہ خدا اور یہ انبیاء اب داستانوں کا حصہ بن چکے ہیں. ایک ایک کر کے سچائیاں اور حقیقتیں ان کی جگہ لیتی رہی ہیں. مافوق الفطرت تقریباً ختم ہو چلا ہے اور اس کی جگہ فطرت لے رہی ہے. خدا پسپا ہو رہے ہیں اور انسان ان کی جگہ لے رہے ہیں.

قوموں کی بھی افراد کی طرح بچپن، بلوغت اور تنزل کی منزلیں ہوتی ہیں. مذاہب بھی قوموں ہی کی طرح ہوتے ہیں. یہی سنگدل سفر ہر کسی کا مقدر ہوتا ہے. خدا بھی اپنی خالق قوموں کے ساتھ ہی فنا ہو جاتے ہیں. ان کو انسان نے بنایا ہوتا ہے اور انسان ہی کی طرح انہوں نے ایک دن رخصت ہونا ہوتا ہے. کسی ایک دور کے خدا اگلے دور کے لیے بس ایک نمونہ ہی رہ جاتے ہیں. آج کے

مذاہب اور آج کی قوموں کو مستقبل کے استہزا سے کوئی استثنٰی حاصل نہیں. جب ہندوستان دنیا کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا تو برہما راج کرتا تھا. جب طاقت مصر کے ہاتھوں میں چلی گئی تو آئنس اور اوسیرس انسانیت سے خراج لیتے تھے. جب یونانی عروج پر تھے تو زیوس کا طوطی بولتا تھا. بڑے عرصے تک زمین روم کے خداؤں کے پیروں تلے کانپتی رہی. پھر روم گرا اور دین ابراہیمی کے خدا نے اپنی سرخ تلوار نکال لی. آج کل یہی خدا حکمران بنا بیٹھا ہے. دیکھنا یہ ہے کہ اگلی باری کس کی ہے اور کب آتی ہے.

سوائے دنیا کے چند حصوں کے باقی ہر جگہ ہر نئے دن کے ساتھ مذہبی نظریات کی شدت میں بتدریج کمی آتی جا رہی ہے. اور جن چند جگہوں پر ابھی بھی کسی خدا کے نام پر خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے یہ بھی شمع کے بجھنے سے پہلے والی پرجوش ٹمٹماہٹ ہی ہے. ہر روز ان آسمانی کتابوں اور عقیدوں سے پرانا زہر نکلتا جا رہا ہے. مذاہب کی خونی گرفت آہستہ آہستہ کمزور پڑتی جا رہی ہے. انہی پرانی تاویلیں کو جو کبھی لوگوں کو باآسانی بیوقوف بنا لیتی تھیں اب اس نئے انسان سے صرف تحقیر ہی ملتی ہے. رسمیں کچھ رہ گئی ہیں مگر مذہب کی روح آہستہ آہستہ دم توڑتی نظر آ رہی ہے. سائنس کی بے رحم تحقیق نے معجزوں کی کمر ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے توڑ کر رکھ دی ہے. سائنس اور مذہب کی یہ جنگ اب اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ دونوں کا نہ تو ایک ذہن میں اور نہ ہی ایک دنیا میں اکٹھے رہنا اب ممکن ہے.

مشاہدہ، دلیل اور تجربہ سائنس کے تین مقدس ستون ہیں. ان تینوں نے مل کر ہمیں بتایا ہے کہ خوشی واحد اچھائی ہے. اور اس کا وقت ابھی اور یہاں ہے. اگر خود خوش رہنا ہے تو پھر اپنے ارد گرد کے لوگوں کو بھی خوش رکھنا ہو گا. ہمارے لیے یہی کافی ہے. اس عقیدے کے ساتھ ہم جی بھی سکتے ہیں اور مر بھی سکتے ہیں. اور اگر کبھی، بالفرض محال، کسی مافوق الفطرت ہستی کا سراغ لگا بھی لیا گیا تو اس کے سامنے جھکنے کے لیے کافی وقت ہو گا. آیئے تب تک کے لیے اپنی ریڑھ کی ہڈیاں سیدھی رکھ کر بلند قامت کھڑے ہوں.

تمام ادوار میں بہادر ملحدین انسان کے حقوق کے لیے لڑتے رہے ہیں اور مذہب ان کو اسی طرح برابر اپنے ظلم کی چکی میں پیستا رہا ہے. مذہب کے ٹھیکے داروں کو اب تک پتہ چل جانا چاہیئے تھا کہ انسان کو اس کی آزادئ رائے کے حق سے محروم رکھنا تقریباً ناممکن ہے. مذہب کی ایذا رسائی کی تاریخ بتاتی ہے کہ

تشدد سے انسان کی سوچ کو قابو نہیں کیا جا سکتا. جب حقیقت ایک دفع اس پر آشکارا ہو جاتی ہے تو یہ فرسودہ خیالات کے لیے موت ثابت ہو کر ہی رہتی ہے.

ایک دفعہ ایک جراح نے ایک معذور کو اپنی خدمات پیش کیں. اس نے اس معذور شخص کو بڑی تفصیل سے اس کی بیماری کے بارے میں آگاہی دی، اس کے علاج کی دوایوں کا بتایا، روزانہ مشق، روشنی اور تازہ ہوا کے فوائد بتائے اور اچھی صحت بر قرار رکھنے کے مختلف طریقوں سے روشناس کرایا. مریض گھبرا کر چیخ اٹھا، "خدا کے لیے مجھ سے میری بیساکھیاں مت چھیننا. ان کے بغیر میں بلکل ہی ناکارہ ہو جاؤنگا." ڈاکٹر بولا، "میں کبھی بھی آپ کی بیساکھیاں نہیں چھینوں گا. میں تو بس آپ کا علاج کروں گا اور آپ کو اس حالت میں لے کر آؤں گا کہ آپ خود یہ بیساکھیاں پھینک سکیں." ابھی تک مذہب کے ساتھ چمٹے رہنے والے لوگوں کا بھی بس ایسا ہی کچھ حال ہے.

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے سب کچھ دریافت کر لیا ہے یا ہمارے نظریے سو فیصد درست ہیں. اس لیے کہ ہمیں انسان کی ترقی کی کوئی حد نہیں نظر آتی. ابھی تک ہم مادے اور طاقت کی لامتناہی گتھیوں کو مکمل طور پر سلجھانے

میں بھی کامیاب نہیں ہوئے ہیں. ایک ذرے کی مکمل تاریخ اتنی ہی معلوم ہو سکی ہے جتنی کہ اس کل کائنات کی. پانی کا ایک قطرہ اتنا ہی حیرت انگیز ہے جتنا کہ پورا سمندر. ایسے ہی ایک پتہ پورے جنگل جیسا اور ریت کا ایک ذرا تمام صحراؤں جیسا.

ہم مستقبل کو پابند سلاسل نہیں کر رہے بلکہ اپنے حال کو آزاد کروا رہے ہیں. ہم اپنے بچوں کے لیے بیڑیاں نہیں بنا رہے بلکہ وہ بیڑیاں کاٹ رہے ہیں جو ہمارے آباواجداد نے ہمیں پہنائی تھیں. ہم سوچ، دریافت اور تفتیش کے وکیل ہیں. اس کو ہمارا اقرار بھی سمجھ لیا جائے کہ ہم جہاں تک پہنچ پائے ہیں اسی پر اکتفا کرنے والے نہیں. فلسفہ اندھے ایمان والا نہ تو تکبر رکھتا ہے اور نہ ہی انا. جہاں توہمات چار دیواریاں بناتے ہیں اور رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں وہاں سائنس سوچ کی شاہراہیں کھولتی ہے. ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم سب معلوم کر چکے ہیں اور ہر مشکل کا توڑ ہے ہمارے پاس مگر یہ ضرور جان چکے ہیں کہ انسان سے محبت خدا کے خوف سے بدرجہا بہتر ہے کہ رٹی رٹائی تسبیحیں الٹنے کی بجائے اپنی آزاد سوچ کی تفتیش میں زیادہ عظمت ہے. ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ زمین پر انسان کو مکمل آزادی تب تک نہیں مل سکتی جب تک یہ آسمانوں کے ظالم حکمرانوں کی

غلامی کرتا رہے گا. ہم اپنی زندگیوں میں سب کچھ کو تکمیل تک تو نہیں پہنچا سکیں گے مگر انسانیت کی ترقی اور بقاء کیلیئے جو بھی ہم سے ہو سکا کریں گے. ہم جانتے ہیں کہ صرف خداؤں اور توہمات سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ انسان کی مکمل خوشحالی تک اس جد و جہد کو جاری رکھنا ہو گا. صرف زمین کو جنگلوں سے صاف کر دینے سے ہی زراعت ترقی نہیں کرتی. نہ ہی صرف سمندروں سے بحری قزاقوں کا خاتمہ کرنے سے تجارت فروغ پاتی ہے.

ہم مستقبل کے ایک عالیشان مندر کی بنیادیں ڈال رہے ہیں. ایک ایسا مندر جو خداؤں کا نہیں بلکہ انسانوں کا مندر ہو گا. ایک ایسا مندر جس کی واحد رسم انسانیت کا جشن منانا ہو گی. ایک ایسا مندر جس میں توہمات کو نہیں سچائیوں اور ثابت شدہ حقیقتوں کو تاج پہنائے جائینگے. ہم ایک ایسے وقت لانا چاہتے ہیں جب دلیل اور ثبوت ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اسی مندر میں دنیا کے ذہن کے تخت پر بادشاہوں کے بادشاہ اور خداؤں کے خدا بنے بیٹھے ہونگے.

اور وہ وقت دور نہیں.

~*~*~*~*~